ماہنامہ

قومی ڈائجسٹ

لاہور

ستمبر 2019ء

ایک ہنگامہ خیز دور کی کہانی
حافظ شفیق الرحمان کی زبانی

اہل مغرب پریشان ہیں کہ
یہ کون لوگ ہیں جو
ہماری بنیادیں ہلا رہے ہیں

الخدمت فاؤنڈیشن نے یتیموں کے تصور کو پروموٹ کیا ہے
لوگ تیار ہو رہے ہیں کہ یہ بچے ہماری ذمہ داری ہیں

صدر الخدمت فاؤنڈیشن
محمد عبدالشکور سے خصوصی ملاقات

ڈیڑھ صدی پیشتر کا
نواب بھوپال سکندر بیگم
کا سفرنامہ حج

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

روزنامہ پاکستان

قوم کے ہر فرد کی آواز

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

ستمبر 2019 ◉ جلد 41 ◉ شمارہ 9

چیف ایڈیٹر
مجیب الرحمٰن شامی

ایڈیٹر
عثمان شامی

مینجنگ ایڈیٹر
علی شامی

سینئر ایڈیٹر
خالد ہمایوں

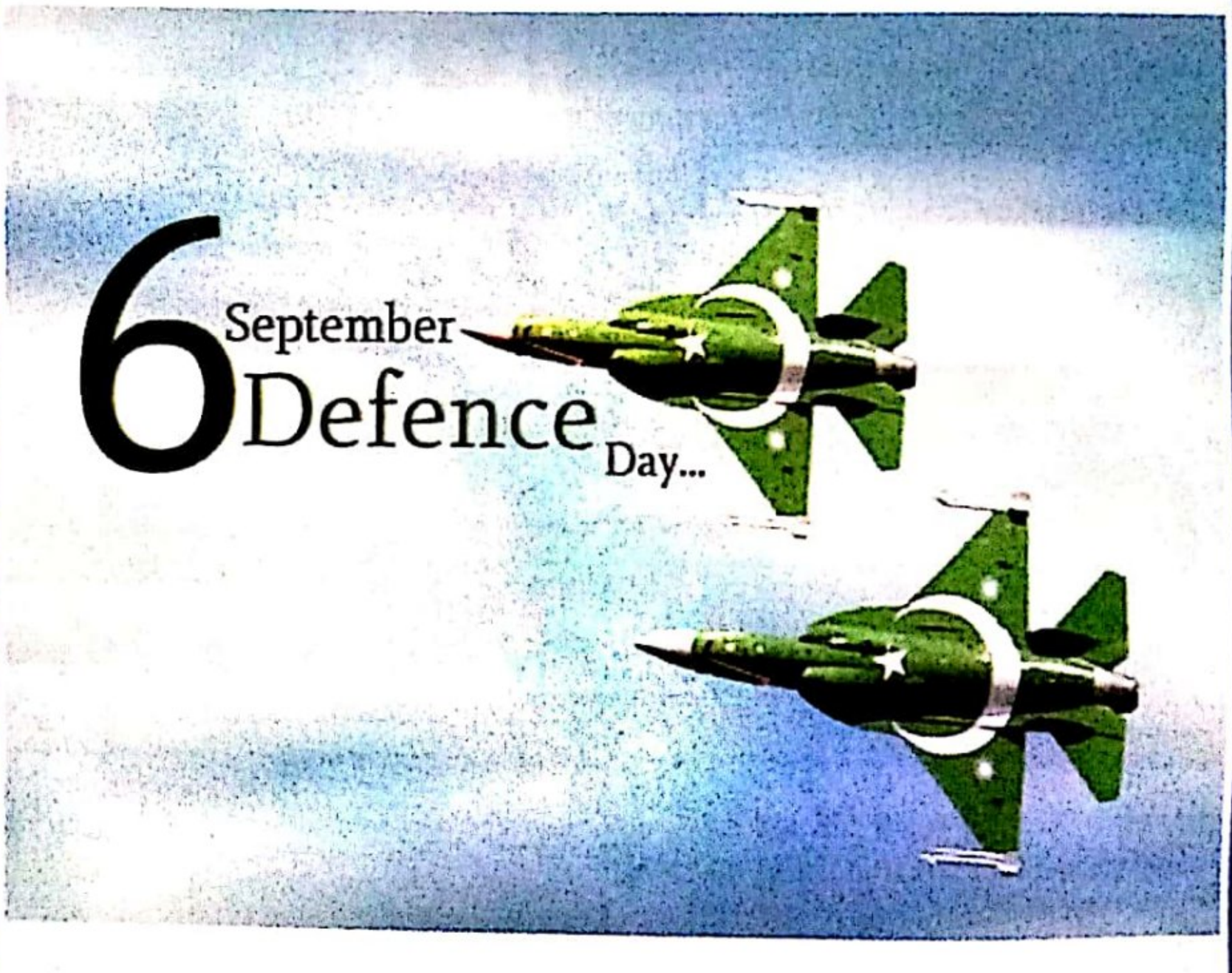

قیمت: پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے ۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم ۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
دیگر ممالک بدلِ اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بلجیم،
اٹلی، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے انڈونیشیا، ملائیشیا، نائیجیریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

دفتر و کتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 042-35404061-65

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس شمارے میں

انٹرویو — محمد عبدالشکور — حامد ولید — 9

طنز و مزاح — لطائف — ایثار رانا — 56

کشمیریات — کشمیر کی بیٹیاں — عبدالوارث ساجد — 39

دو نظمیں (کشمیر پر) — حفیظ تائب — 38

اسلامیات — سچائی ہی ذریعہ نجات ہے! — صباء چودھری — 147

کہانیاں — جن پہ تکیہ تھا (پراسرار کہانی) — شاہد لطیف — 43

رخصتی — نگوئن تھی — 139

جو رہی سو بے خبری رہی — راشد اشرف — 165

آپ بیتی — ایک ہنگامہ خیز عہد کی کہانی حافظ شفیق الرحمان کی زبانی — مرتب: عبدالستار اعوان — 57

سماجیات — سیاہی اور سفیدی — محمد فاروق عزمی — 113

قرآنیات — زرعی ترقی کے قرآنی اشارات — بشیر احمد قریشی — مرتب: محسن فارانی — 116

سیر و سیاحت — تُرکی بہ ترکی — ڈاکٹر فرید احمد پراچہ — 153

بک شیلف — نواب بھوپال سکندر بیگم کا سفرنامۂ حج — لیفٹیننٹ کرنل (ر) غلام جیلانی خان — 123

علم و حکمت — کہاوتیں — غلام ربانی — 169

کتب مینار — گریزاں (شعری مجموعہ)، صدیق سالک: شخصیت اور فن
پہنو چاند کلائی میں (شعری مجموعہ)، خاکے وا کے
اساں دل نوں مُرشد جان لیا، اقبال مزاح کی زد میں
مرتب: خالد ہمایوں — 175

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

خطابت سیاست اور صحافت

ایک ہنگامہ خیز عہد کی کہانی حافظ شفیق الرحمان کی زبانی

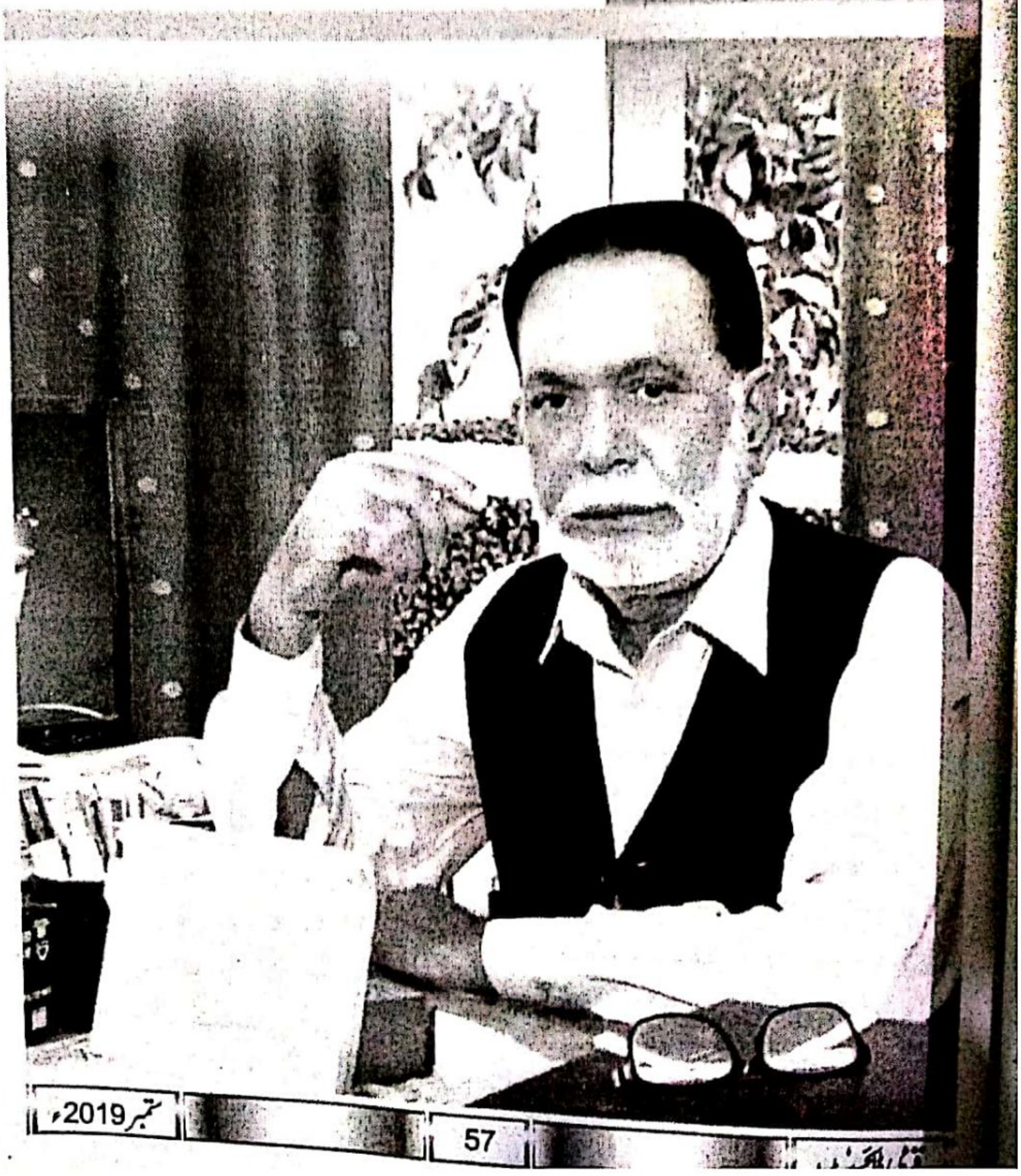

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

حافظ شفیق الرحمٰن گزشتہ 45 برس سے اردو صحافت کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ انہوں نے علم و ادب سے مرصع فی البدیہہ گفتگو اور منفرد طرزِ نگارش کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ انہوں نے برسوں کی ریاضت کے بعد علم، ادب اور صحافت کی دنیا میں اپنی بالکل منفرد شناخت قائم کی ہے۔ وہ دُنیوی اور دینی علوم سے آراستہ ہیں، ان کے مطالعہ کا میدان وسیع ہے۔ بہت سے مشاہیر سے براہ راست یا ان کے رشحاتِ قلم کے ذریعے کسب فیض کیا۔ خطابت کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے تاریخی حبیبیہ ہال میں ''اقبال اور مُلا'' کے موضوع پر لب کشا ہوئے، اس کے بعد ان کے جنوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

حافظ صاحب کی پہچان کا ایک اہم حوالہ آغا شورش کاشمیریؒ ہیں۔ دورِ حاضر میں تو گویا حافظ شفیق الرحمٰن کا نام سامنے آتے ہی شورش مرحوم کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ حافظ صاحب صحافت اور خطابت کے میدان میں جہاں اپنے بہت سے اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں وہیں آغا شورش کاشمیری اور ڈاکٹر مسکین علی حجازی کو اپنا اوّلین مرشد، محسن اور مربی خیال کرتے ہیں۔

مرتب: عبدالستار اعوان

ہماری حافظ صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے۔ گزشتہ دنوں ہم نے ان کے ساتھ چند طویل نشستیں کر کے ان کی یادداشتیں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ سوالات کچھ یوں ترتیب دیئے کہ حافظ صاحب کے فی البدیہہ اور مربوط جوابات سے ایک خوبصورت آپ بیتی وجود میں آ گئی ہے جس سے ''قومی ڈائجسٹ'' کے باذوق قارئین یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

میرا ایسا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں جو کہ عموماً شہزادوں کے ہاں کیا جاتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود''۔ میں تو ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے ددھیال کا تعلق ضلع مانسہرہ کی تحصیل اوگی سے تھا۔ اوگی وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پاکستان کا سوئٹزرلینڈ ہے۔ میرے والد صاحب وہیں پیدا ہوئے۔ اوگی کے مضافات میں بہت زیادہ بلند و بالا پہاڑی علاقے ہیں۔ ''کھبل'' میں میرے دادا شیر زمان (مرحوم) کی زمین تھی جہاں وہ کاشتکاری کر کے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ دادا جان ایک متوسط طبقے کے کاشتکار اور زمین دار تھے۔ یہ نوابی دور تھا اور دیسی ریاستیں موجود تھیں۔ اس دور میں زمین کے جملہ حقوق ملکیت بحق نواب یا بحق سردار محفوظ ہوتے تھے لیکن میرے دادا کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کی زمین اپنی تھی اور کسی نواب یا سردار کی ہبہ کی ہوئی یا بخشی ہوئی جائیداد نہ تھی۔ انہوں نے اپنی محنت سے یا ان کے والد یعنی میرے پردادا نے اپنی محنت سے یہ زرعی زمین حاصل کی ہوگی۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرا خاندانی پس منظر

میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہمارے آبائی علاقہ کا نام ''کھبل'' تھا۔ کھبل گوجری زبان میں سرسبز، شاداب، شگفتہ اور پرفضا جگہ کو کہتے ہیں۔ کھبل گاؤں میرے والد صاحب کی جنم بھومی ہے۔

میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہماری قومی شناخت کے معاملے میں ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا بنانے والوں نے بڑی گڑبڑ کردی ہے۔ ایک طبقہ تو یہ کہتا ہے کہ ہماری گوت اور قوم چوہان ہے اور دوسرا طبقہ جو کہ ''تاریخ گوجراں'' لکھتا ہے اس کے مطابق چوہان دراصل گوجر ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو تاریخ راجپوتاں کے مصنفین ہیں ان کے ہاں چوہان دراصل راجپوت ہیں۔ بہر حال میں نجیب الطرفین چوہان ہوں۔ میری والدہ اور والد صاحب دونوں چوہان برادری سے تھے۔ بہرکیف گوجری خون ہو یا راجپوتی، ایک بات ان میں مشترک یہ ہے کہ کسی بھی غلط بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ بنیادی طور پر زمانہ قدیم ہی سے یہ جنگجو قسم کی اقوام ہیں اور ان کو کبھی تسخیر نہیں کیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کے مجاہدین کے ذکر میں میرے آبائی گاؤں ''کھبل'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''کھبل کے ایک زمین دار نے مجاہدین کی ضیافت و نصرت کی تھی''۔ اس زمین دار سے مراد میرے پردادا جان مرحوم ہیں۔ اب جس طرح آج کل کہتے ہیں کہ یہ بنیاد پرست، انتہا پسند اور قدامت پسند ہیں۔ تو میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ یہ بنیاد پرستی، اسلام سے انتہا درجہ محبت ہمارے خون میں شامل ہے اور میں اسی تناظر میں سب سے بڑی جہادی تنظیم اور سب سے بڑی مسلح مسلم طاقت افواج پاکستان کو سمجھتا ہوں۔ یہ میرا اپنا ایک نقطہ نظر ہے جس سے کسی کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔

میرے دادا کا نام شیر زمان اور والد صاحب کا نام عزیز الرحمٰن تھا جو بعد میں مولانا عزیز الرحمٰن اور ''امام صاحب'' کے نام سے معروف ہوئے۔ والد صاحب صرف دو سال کے تھے کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور میرے دادا نے دوسری شادی کر لی۔ جب میرے والد صاحب کی سوتیلی ماں آئیں تو وہ ایک روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئیں۔ چونکہ زمین دار اور کاشتکار گھرانہ تھا اور سوتیلی ماں نے ایک چار سال کے بچے کے ذمے جانوروں کی دیکھ بھال اور چارہ وغیرہ لانا لگا دیا تھا۔ سوتیلی ماں میرے والد صاحب کے سر پر گھاس وغیرہ لاد دیا کرتیں اور جانوروں کا گوبر بھی والد صاحب سے اٹھوایا کرتی تھیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر میرے والد کی شکایت میرے دادا سے کرتی تھیں اور پھر دادا مرحوم ''نظریہ ضرورت'' کے تحت میرے والد صاحب کو ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

میرے والد صاحب دو بھائی تھے۔ میرے تایا کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ بھی ساری عمر اوگی ضلع مانسہرہ ہی میں رہے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ والد صاحب کی اوگی میں 82 کنال زمین تھی جس میں سے انہوں نے چار کنال جگہ مسجد اور آٹھ کنال مڈل سکول کے لیے دے دی اور چار کنال زمین اپنے ایک بھتیجے کو دے دی تھی۔ میرے والد صاحب نے انہیں کہا کہ ہم تو چونکہ لاہور ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں لہذا تم یہ جگہ سنبھالو اور اس کی دیکھ بھال کیا کرو۔ اس علاقے کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ یہ ایسا پرفضا مقام ہے کہ اس کے قریب ہی چھتر پلین کے علاقے میں بھٹو صاحب نے ایک ہوائی اڈہ بنوانا شروع کیا تھا۔ اب

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

معلوم نہیں وہ ہوائی اڈہ بن چکا ہے یا نہیں۔ یہ ہوائی اڈہ اس لیے بننا تھا کہ یہ ایک خوبصورت مقام ہے اور بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ اسے ایک سیاحتی مقام کے طور پر دنیا بھر میں متعارف کروایا جائے۔ پھر وہاں پر ڈویلپمنٹ بھی خوب ہوئی۔ اب گاؤں اوگی، پٹن اور کھبل میں ہر طرف سڑکوں کا جال بچھ چکا ہے۔

خیر ذکر ہو رہا تھا میرے والد مرحوم کا تو وہ اپنی سوتیلی ماں کے نامناسب اور ناروا رویے سے بدک کر گھر سے بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنا پہلا پڑاؤ مانسہرہ کے قریب ایک جگہ ہے ''خاکی'' وہاں پر ڈالا۔ یہاں ایک عالم دین تھے جو بچوں کو پڑھاتے تھے۔ والد صاحب نے ان سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں سے والد صاحب نے ابتدائی حروف تہجی پڑھے اور کچھ فارسی بھی پڑھی۔ پڑھتے بھی تھے اور اپنے استاد کے جانوروں کو چارہ بھی ڈالتے اور ان کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ اس دور میں استاد کی خدمت کا تصور بھی بہت زیادہ تھا کہ جو بھی استاد کی خدمت کرے گا صرف اسی کو عروج اور ارتقا ملے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا ذلیل و خوار ہوگا۔

والد صاحب کی تاریخ پیدائش تو مجھے یاد نہیں ہے لیکن وہ بتایا کرتے تھے کہ جب میں گھر سے خاکی گاؤں میں آیا تھا تو میری عمر پانچ سال تھی اور پانچ سال خاکی ہی میں قیام کیا۔ پھر جب میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستان سعدی اور بوستان سعدی وغیرہ پڑھ لیں تو میں پشاور میں آ گیا اور پشاور کے ایک پرائمری سکول سے پانچ جماعتیں پاس کیں۔ اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ والد صاحب تین چار سال کی عمر میں گھر سے نکلے تھے۔ پانچ سال انہوں نے خاکی اور پانچ سال پشاور میں گزارے تو یہ تقریباً تیرہ یا چودہ سال کی عمر بن جاتی ہے اور پھر والد مرحوم اسی عمر میں امرتسر چلے گئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش کیا ہو گی۔ اس زمانے میں ایسا کوئی جنم پرچیوں یا فارم ب وغیرہ کا تو رواج ہی نہ تھا اور خاص طور پر کوہستانی علاقوں میں تو ایسا کوئی ادارہ نہ تھا جو بچوں کی پیدائش کا ریکارڈ مرتب کرتا۔

مسجد خیر دین امرتسر میں تعلیم

والد صاحب بتاتے تھے کہ امرتسر میں مولانا داؤد غزنوی کا ایک دینی ادارہ قائم تھا، میں نے وہاں داخلہ لے لیا لیکن مجھے یہ مشکل پیش آئی کہ میں خاکی گاؤں میں جن مولوی صاحب سے پڑھتا تھا وہ حنفی مسلک کے تھے اور یہ اہل حدیث اور شافعی مسلک کے۔ یہاں جب میں پہلے دن نماز کے لیے کھڑا ہوا اور ناف پر ہاتھ باندھے تو میرے دائیں بائیں کھڑے طالب علموں نے زبردستی میرے ہاتھ کھینچ کر میرے سینے پر کر دیئے اور بعد میں مجھے کہا گیا کہ اب آپ نے نماز اسی طرح پڑھنی ہے۔ (خیر یہ بھی شرعی طریقہ ہے اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا)۔ والد صاحب کو استاد بھی ڈانٹا کرتے تھے کہ نماز اس طرح پڑھنی ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل جب ایک چھوٹے سے بچے پر زبردستی لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ یہاں سے بھی باغی ہو گیا۔ کیونکہ میرے والد صاحب ایک کاشتکار گھرانے سے تھے اور باغیانہ خیالات کے مالک تھے۔ زمین دار کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور وہ کسی کی غلامی نہیں کرتا۔ چنانچہ والد صاحب نے نماز کے اس زبردستی طریقے کو بھی ''غلامی'' ہی پر محمول کیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ تو بہت ہی جابرانہ انداز سے پڑھا رہے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہیں، چنانچہ انہوں نے اس ادارے کو اپنے طور پر الوداع کہا اور امرتسر ہی میں ایک مشہور مسجد تھی جس کا نام مسجد خیر دین ہے، گو کہ اب اس مسجد میں اکا دکا نمازی ہی پائے جاتے ہیں (جب 2005ء میں مَیں امرتسر گیا تو میں نے یہ مسجد دیکھی تھی) لیکن ایک دور میں اس مسجد سے جید علماء نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو زبان کے سب سے بڑے اور نامور خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے بھی ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی اور اپنی خطابت کا آغاز بھی امرتسر سے شروع کیا تھا۔ جب والد صاحب اس مسجد میں آئے تو وہاں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز مفتی محمد حسن امرتسریؒ موجود تھے۔ مفتی صاحب نے اپنا سب سے پہلا مدرسہ اسی مسجد خیر دین ہی میں قائم کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد جب لاہور تشریف لائے تو یہاں انہوں نے جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد اور بعد میں جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ کی بنیاد رکھی۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ جب میں مسجد خیر دین میں زیر تعلیم تھا اور میری عمر اس وقت پندرہ سولہ سال تھی کہ مورخہ 21 اپریل 1938ء کی صبح مفتی حسن صاحبؒ نے ہمیں بلایا اور فرمایا کہ لاہور میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا انتقال ہو گیا ہے اور آپ تمام طالب علم ان کی نماز جنازہ میں پہنچیں اور پھر ہم نے استادِ محترم کے حکم کی تعمیل میں شاعر مشرق کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

والد صاحب مسجد خیر دین امرتسر میں 1936ء سے 1947ء تک مفتی حسن صاحبؒ کے پاس زیر تعلیم رہے۔ وہیں امرتسر ہی میں ایک مشہور محلہ ہے شریف پورہ، اس میں والد صاحب نے مسجد خیر دین کے ایک استاد کے کہنے پر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ استاد نے والد صاحب سے کہا کہ دیکھو اب یہ ضروری نہیں ہے کہ تم کسی مسجد میں امامت ہی کرواؤ۔ بہتر یہی ہے کہ شریف پورہ میں ایک دکان کھول لو اور امامت وغیرہ کا کام فی سبیل اللہ انجام دیا کرو۔ استاد کا کہنا تھا کہ ہمارا معاشرہ ایک جاگیردارانہ سوچ کا معاشرہ ہے، جہاں پر ایک مسجد کے امام کو بھی جولاہے، ترکھان اور نائی میراثی کی طرح ایک کمی کمین تصور کیا جاتا ہے۔ مفتی صاحب کی یہ بات میرے والد کے ذہن میں بیٹھ گئی اور انہوں نے شریف پورہ کے بازار میں پرچون کی دکان کھول لی دو تین سال ہی گزرے تھے کہ تحریک پاکستان کامیاب ہو گئی اور امرتسر بھارت کا حصہ بن گیا اور امرتسر کے مسلمانوں کو ہجرت کرنا پڑی۔ امرتسر کے مسلمانوں کو کیوں ہجرت کرنا پڑی اور پھر ان پر کیا گزری، جو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں تو انہیں خواجہ افتخار مرحوم کی کتاب ''جب امرتسر جل رہا تھا'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سکھ، خالصہ اور نہنگ سکھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے تھے اور ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عصمتیں پامال کی جا رہی تھیں اور کیسے شیر خوار مسلمان بچوں کو کرپانوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ خونی مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان حالات میں میرے والد صاحب نے وہاں سے ہجرت کی۔ ہجرت سے صرف دو ماہ قبل یعنی 14 جون 1947ء کو میرے والد صاحب کی شادی ساہیوال سے آگے چیچہ وطنی کے قریب کے ایک گاؤں کوٹلہ جندارام میں نامور عالم دین فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا محمد عمرؒ کی بیٹی سے ہوئی۔ میری ماں جی کا نام حمیدۃ النساء تھا۔ مولانا محمد عمر اسیر مالٹا مولانا محمود حسنؒ اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کے شاگرد تھے۔ میرے نانا جان مولانا محمد عمرؒ کے جو ہم سبق تھے ان میں مولانا مفتی محمودؒ بھی شامل تھے۔ مفتی محمودؒ جب بھی ساہیوال یا چیچہ وطنی آتے تو میرے نانا جان سے ضرور ملتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی نانا جان سے بہت محبت کرتے اور انہیں ملنے آیا کرتے۔ میری والدہ بڑی ثقہ قسم کی نفیس اردو بولتیں۔ وہ فارسی زبان پر عبور رکھتی تھیں اور ان میں علمی و ادبی ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ میرے نانا چونکہ اتر پردیش میں رہے تھے تو یوپی کی اردو زبان کا جو ''لوچ'' نفاست و نزاکت اور لطافت ہے وہ میری والدہ کی زبان میں پوری طرح موجود تھی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ددھیالی طور پر ایک مجاہد اور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور اس پر بھی فخر ہے کہ ایک عالم دین باپ کا بیٹا اور اور نامور عالم دین اور فاضل دیوبند کا نواسا ہوں۔

لاہور میں آمد

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ جب امرتسر سے مہاجرین کو ٹرکوں کے ذریعے لاہور کے مہاجر کیمپوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو خواتین اور مردوں کو الگ الگ ٹرکوں میں لاہور لایا گیا۔ یوں والد صاحب کسی اور ٹرک میں اور والدہ صاحبہ کسی دوسرے میں سوار ہو گئیں۔ لاہور میں ایک بڑا مہاجر کیمپ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی مسجد شیرانوالہ گیٹ کے پاس لگا تھا اور دوسرا بڑا کیمپ والٹن کینٹ میں قائم کیا گیا تھا۔ والد صاحب شیرانوالہ گیٹ پہنچا دیے گئے تو وہاں پہنچ کر انہوں نے والدہ صاحبہ کو بہت تلاش کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ والٹن کیمپ میں جائیں، چنانچہ والد صاحب والٹن کیمپ میں پہنچے اور میری والدہ کو تلاش کر لیا۔ والٹن کیمپ سے لوگوں کو مختلف آبادیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو میرے والد صاحب کو انتظامیہ نے کہا کہ ایم اے او کالج کے قریب ساندہ روڈ پر ایک بستی راج گڑھ ہے اس کے قریب ایک ہندوؤں کا محلہ پریم نگر ہے جہاں بہت سے ہندو گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو آپ وہاں چلے جائیں۔ یوں میرے والد صاحب 20 اگست 1947ء کو اس محلہ کے ساڑھے چھ مرلے کے ایک مکان کے مکین ہو گئے جو بعد ازاں ساٹھ کی دہائی میں انہیں الاٹ ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا جائے۔ چونکہ ہجرت کے فوری بعد درس نظامی کی تکمیل ہونے والی تھی اس لیے والد صاحب مفتی محمد حسن صاحب کو ڈھونڈ رہے تھے اور بہت پریشان بھی تھے۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ راج گڑھ ساندہ روڈ کے قریب میرا آبائی محلہ پریم نگر ہے۔ پریم نگر بہت مشہور محلہ ہے۔ این سی اے ہاسٹل کے قریب چوک سے بائیں ہاتھ ہو کر تیسری گلی میں ہمارا گھر ہے۔ اس گلی کا نام سرن سٹریٹ ہے۔ پریم نگر کے گھروں کی خوبصورتی یہ تھی کہ اگر ایک گھر گلی نمبر تین میں ہے تو گلی نمبر دو میں بھی اس کا دروازہ کھلتا ہے۔ کشادہ گلیاں تھیں، یہ جتنے بھی محلے تھے، ہندو کمیونٹی نے بنائے تھے ان میں کرشن نگر، رام نگر، شام نگر اور سنت نگر شامل ہیں۔ میں صرف اپنے محلے کے قرب و جوار کی بات کر رہا ہوں۔ یہ محلے بڑی زبردست ٹاؤن پلاننگ سے بنائے گئے تھے۔ یعنی اگر آپ میری گلی نمبر 3 میں داخل ہوں گے تو ہر دس گھروں کے بعد ایک چوک آ جائے گا۔ اس طرح یہ بڑا ہی خوبصورت محلہ تھا۔ لیکن 20 اگست 1947ء کو میرے والد صاحب کو اس محلے میں جو کمی محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ ہم سب یہاں مسلمان آباد ہو گئے ہیں لیکن یہاں مسجد ہی نہیں ہے اور اذان تک نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہماری گلی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نمبر تین ہی میں ایک خالی پلاٹ پڑا ہوا تھا جو25 مرلے کے قریب تھا تو محلے داروں نے والد صاحب سے کہا کہ آپ اذان دے دیا کریں اور ہم اس خالی پلاٹ میں آپ کی اقتدا میں نماز ادا کر لیا کریں گے۔ یہاں مسلمان فی الحال ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے کیونکہ کوئی امرتسر سے آیا تھا اور کوئی فیروز پور، جالندھر اور پٹیالہ سے۔

مسجد کی امامت

ہمارے پریم نگر محلے میں زیادہ تر وہ مسلمان آباد ہوئے جو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ لوگ والد صاحب سے کہنے لگے کہ آپ بتاتے ہیں کہ آپ نے دینی تعلیم حاصل کی ہے تو آپ ہی آگے آئیں اور اذان و جماعت کا اہتمام کریں۔ میرے والد صاحب نے کہا، نہیں اس وقت تک یہاں نماز باجماعت نہیں ہوگی جب تک اس پلاٹ کا پتہ نہ چل جائے کہ آیا یہ جگہ متروکہ وقف املاک بورڈ (ایویکیو ای ٹرسٹ) کی ہے یا کسی اور کی۔ جب تک اس پلاٹ کے مالک سے باقاعدہ اجازت نہ لی جائے تب تک ہمیں یہاں پر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے۔ اب اسے حسن اتفاق ہی سمجھئے کہ پوری ہندو آبادی میں یہ جو پلاٹ تھا یہ ایک مسلمان خاتون کا تھا جو مزنگ (لاہور) ہی کی رہنے والی تھیں۔ 23 اگست کو ایک وفد اس خاتون کے پاس گیا۔ (اس خاتون کا نام اب میرے ذہن میں نہیں آ رہا)۔ انہیں بتایا گیا کہ ہم پریم نگر سے آئے ہیں جہاں پر ہندوؤں کے جنج گھر اور سکھوں کا گوردوارہ تو موجود ہے لیکن مسجد موجود نہیں تو خاتون نے کہا کہ میری طرف سے تحریری اجازت ہے کہ آپ وہاں پر مسجد بنا لیں۔ اس خاتون نے پلاٹ کے کاغذات میرے والد صاحب کو دے دیئے کہ آپ اس پر مسجد بنا لیں۔ اب اس خالی پلاٹ پر اذان اور جماعت شروع ہوگئی۔ ایک دن والد صاحب مین سانده روڈ پر جا رہے تھے کہ ان کی ملاقات پرویز حنیف (لاہور چیمبر آف کامرس کے سابق صدر) کے والد شیخ حنیف اور ان کے دادا شیخ کوثر مرحوم سے ہوگئی۔ شیخ حنیف صاحب کو سانده روڈ پر آٹھ دس کنال جگہ الاٹ ہوئی تھی۔ یہ بڑے کاروباری لوگ تھے اور ان کا بھارت میں کارپٹ کا بڑا بزنس تھا۔ جب یہ لوگ لاہور آ گئے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے عوض انہیں یہاں پر کافی جگہ ملی۔ شیخ حنیف نے والد صاحب سے حالات پوچھے تو والد صاحب نے انہیں پلاٹ اور مسجد کا معاملہ بتایا اور کہا کہ یہ پلاٹ ایک خاتون نے انہیں ہبہ کر دیا ہے۔ شیخ حنیف نے پلاٹ کے کاغذات وغیرہ دیکھنے کے بعد کہا کہ اب مسجد کی تعمیر کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں اور یہ مکمل مسجد ہم بنوائیں گے۔ چنانچہ یہ مسجد انہوں نے ہی بنوائی۔ اس مسجد میں والد صاحب نے اواخر 1947ء سے 1998ء تک امامت کے فرائض انجام دیے۔ مورخہ 14 اگست 2004ء کو میو ہسپتال میں صبح 9 بجے ان کا اس وقت انتقال ہوا جب یوم آزادی کے سلسلے میں قومی ترانہ پڑھا جا رہا تھا۔

اس سارے عرصے میں کبھی اس مسجد میں چندہ نہیں ہوا، جتنے بھی اخراجات تھے وہ شیخ حنیف اور پھر ان کی اولاد ہی ادا کرتی تھی۔ شاید اب بھی ایسا ہی ہو بہرحال تازہ صورتحال میرے علم میں نہیں۔ والد صاحب نے مسلسل اکاون سال تک اپنی قائم کردہ مسجد اقبال میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیے۔ اس سارے عرصے میں ان کا یہ معمول رہا کہ ہر سال 14 اگست کے موقع پر نماز فجر کے بعد تحریک

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

پاکستان کے اغراض ومقاصد بیان فرماتے اور پاکستان کی تعمیر وترقی کے لیے دعا کرواتے۔ ان تقریبات میں معروف ماہر اقبالیات پروفیسر منور مرزا، سرراہے، (نوائے وقت) کے کالم نگار پروفیسر سلیم میر و دیگر حضرات بھی اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔

ہمارے محلے میں ایک سکول ''نیو ماڈل گرلز ہائی سکول'' تھا جس کی ہیڈ مسٹرس بڑی ہی ''رابعہ صفت'' خاتون تھیں، انہیں پورا محلہ خالہ جان کہتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم ایس سی کیمسٹری کیا ہوا تھا۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ ہم باقاعدہ برقعے میں علی گڑھ یونیورسٹی جایا کرتی تھیں۔ خالہ جان کی پوری زندگی میں کسی نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر وقت پردے میں رہا کرتیں۔ میں بچپن میں ان کے پاس پڑھتا رہا تو بس خالہ جان کا کچھ چہرہ یاد ہے۔ خالہ جان اپنے شاگردوں سے بھی جب وہ بڑے ہوجاتے تو پردہ کرلیا کرتیں۔ ایک مرتبہ خالہ جان نے شیخ حنیف صاحب سے کہا کہ مجھے مسجد میں کچھ حصہ ڈالنا ہے اور مسجد کا برآمدہ تعمیر کروانا چاہتی ہوں۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اگر امام صاحب اجازت دے دیں تو آپ بے شک تعمیر کروادیں۔ یوں اس مسجد کا برآمدہ خالہ جان نے تعمیر کروایا تھا۔ میرے والد صاحب کو پورا محلہ ''امام صاحب'' کہہ کر پکارتا تھا۔ بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث غرض ہر مسلک کے لوگ میرے والد صاحب کا بہت ہی احترام کرتے اور انہیں امام صاحب کہا کرتے۔ مسجد تعمیر ہوگئی تو لوگوں نے والد صاحب سے مسجد کے نام کے بارے میں مشاورت کی تو چونکہ والد صاحب کے دل و دماغ میں پاکستانیت اور علامہ اقبالؒ سے محبت رچی بسی تھی اور وہ بتایا کرتے تھے کہ جب سے مجھے اپنے استاد مفتی محمد حسن امرتسریؒ نے حکم دیا تھا کہ لاہور جاؤ اور اقبالؒ کا جنازہ پڑھو تو اس کے بعد سے میرے دل میں علامہ اقبالؒ کی ارادت و عقیدت میں ہر گزرتے پل اضافہ ہوتا گیا۔ والد صاحب نے کہا کہ چونکہ ملت اسلامیہ کو وحدت کا پیغام دینے والی شخصیت علامہ اقبالؒ ہی تھے تو کیوں نہ مسجد کا نام ''مسجد اقبال'' رکھا جائے۔ چنانچہ مسجد کا یہی نام رکھ دیا گیا۔ والد صاحب نے اس مسجد پر کسی مخصوص مسلک کی چھاپ کبھی نہ لگنے دی، وہ ناپسند فرماتے کہ کسی مسجد کے باہر لکھا ہو کہ یہ مسجد فلاں مسلک کی ہے۔

والد صاحب مطالعہ کے بہت عادی تھے اور ان کے کمرے میں بہت سی کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ رات کے وقت کوئی بھی بچہ ان کے کمرے میں اس وجہ سے نہیں سوسکتا تھا کہ وہ رات کا زیادہ حصہ عبادت یا پھر مطالعہ میں گزارتے تھے اور رات بھر لائٹ جلتی رہتی تھی لیکن مجھے چونکہ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا تو میں انہی کے کمرے میں سوتا تھا۔ والد صاحب ایک کٹر قسم کے مذہبی لیکن نہایت کشادہ ظرف رکھنے والے انسان تھے۔ اسلام اور وطن سے بے پناہ محبت ان کے رگ وریشے میں بسی تھی۔ میں نے اپنے شعور کے بعد چالیس سال تک ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ وہ ہر نماز کے بعد پاکستان اور افواج پاکستان کی ترقی، استحکام اور سلامتی کے لیے دعا کروایا کرتے۔

مسجد کی تعمیر کے بعد شیخ حنیف مرحوم نے کہا کہ اس آبادی کے لوگ غریب ہیں، لٹے پٹے ہوئے آئے ہیں لہٰذا مسجد کو اپنے اخراجات کے معاملے میں خود کفیل ہونا چاہیے تو انہوں نے مسجد کے ساتھ ہی 11 دکانیں بنوادیں جن میں سے ایک دکان میرے والد صاحب نے باقاعدہ کرایہ پر حاصل کی اور وہیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

امرتسر والا پرچون کا کام شروع کیا۔ والد صاحب نے کہا تھا کہ میں مسجد میں امامت کے پیسے نہیں لیا کروں گا لیکن وہ بہر حال ایک ''ٹوکن ملی'' کے طور پر کچھ پیسے لیتے تھے جیسا کہ گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان نے کہا تھا کہ میں گورنری کی تنخواہ نہیں لیتا اور صرف ایک روپیہ اس لیے لیتا ہوں تا کہ مجھے محسوس ہو کہ میں سرکار کا نوکر ہوں۔ بس والد صاحب بھی اسی نظریے کی بنیاد پر کچھ پیسے لیتے تھے لیکن ان کا مستقل ذریعہ معاش اپنی پرچون کی دکان ہی تھا۔ دکان اتنی چل نکلی تھی کہ انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو اچھی تعلیم دلوائی۔ وہ اکثر ہم سے کہتے کہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسجد میں آ کر وہ بندہ بھی مولوی صاحب سے دینی مسائل کے معاملے میں بحث و تمحیص کرتا اور سینگ پھنساتا ہے جس نے دین کے متعلق ایک بھی کتاب نہیں پڑھی ہوتی۔ قرآن کا ایک رکوع بھی ترجمے کے ساتھ نہیں پڑھا ہوتا اور صحاح ستہ کی کتابوں میں سے کسی ایک بھی کتاب کا ایک ورق بھی نہیں پڑھا ہوتا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ مولوی بے چارہ اتنا بدقسمت اور کمزور ہے کہ محض محلے داروں کی چندہ نما تنخواہ پر پلنے کی وجہ سے اس قدر ممنونِ احسان ہو جاتا ہے کہ جو بندہ بھی اٹھتا ہے مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے اپنے حکم کی تعمیل کروانا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ کہا کرتے تھے کہ میں اس لیے دکان داری کرتا ہوں کہ میں ایک زمین دار باپ کا بیٹا ہوں اور مجھ سے کسی کی بات نہیں سنی جاتی۔ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمانے والے باپ کا بیٹا ہوں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ دینی تعلیم تو میں نے اپنی آخرت اور اپنی اصلاح کی خاطر حاصل کی تھی، روزگار کے لیے ہرگز نہیں۔ وہ اکثر اپنی سوتیلی ماں کو یاد کر کے کہا کرتے تھے کہ اللہ پاک اس کی مغفرت کرے اور اس کی قبر کو ٹھنڈا بنا دے کہ اگر وہ مجھے دھکے دے کر گھر سے نہ نکالتیں تو میں کبھی دینی تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔ نہ مجھے دین کا شعور ملتا اور نہ میں مفتی محمد حسن امرتسری جیسے اکابرین کے جوتے سیدھے کر سکتا۔ والد صاحب کی عادت تھی کہ کوئی بھی خاص بات یا کسی واقعہ کے متعلق تاریخ کا اندراج اپنے زیرِ مطالعہ کسی کتاب کے بیک ٹائٹل پر کر دیتے تھے تو اس طرح ان کی ایک کتاب پر میری جو تاریخ پیدائش درج ہے اس کے مطابق میں 10 فروری 1954ء کو پریم نگر لاہور میں پیدا ہوا۔ میرے 3 بھائی حبیب الرحمن، عتیق الرحمن اور خالد عزیز اور 4 بہنیں ہیں۔

میری تعلیم و تربیت

ہمارے گھر کی زبان پنجابی تھی۔ گھر میں روزنامہ نوائے وقت آتا تھا تو میری والدہ مجھے باقاعدہ کہتی تھیں کہ خبریں پڑھ کر سناؤ اور جہاں کسی تلفظ میں کوئی غلطی ہوتی تو بڑی محبت اور ملائمت کے ساتھ میری اصلاح فرماتی تھیں۔ یوں میں جلد ہی اردو میں رواں ہو گیا۔ جب میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو اس دور میں ایک مشکل ترین مضمون جو بچوں کے لیے سمجھا جاتا تھا وہ ''قسطنطنیہ'' تھا۔ جب بچوں کی اردو چیک کرنا ہوتی تھی تو ''قسطنطنیہ'' مضمون پڑھنے کو کہا جاتا تھا۔ میں پہلی جماعت میں تھا تو میرے محلے کے ایک صاحب نے مجھے پوچھا، اردو پڑھ لیتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ جی پڑھ لیتا ہوں تو انہوں نے فوری طور پر میرے سامنے کتاب کھول کر یہی قسطنطنیہ والی کہانی رکھ دی کہ یہ پڑھ کر سناؤ اور جب میں نے وہ بالکل درست پڑھ کر سنائی تو انہوں نے مجھے خوب داد دی۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ناظرہ قرآن پاک، ابتدائی اردو اور کچھ فارسی مجھے والدہ صاحبہ نے گھر پر پڑھائی۔ میرے ایک ماموں تھے جن کا نام ماسٹر عبدالحکیم تھا، وہ چیچہ وطنی ہائی سکول میں سینئر ٹیچر تھے۔ ایک دن وہ ہمارے گھر تشریف لائے تو میرے والدین کو میرے متعلق کہا کہ یہ ابھی تک گھر کیوں بیٹھا ہے؟ یہ فارسی، اردو پڑھتا ہے اور طرح طرح کی بولیاں بولتا ہے تو اسے سکول کیوں نہیں بھیجتے؟ یوں اسی دن ماموں جان نے مجھے قریبی پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ یہ 1960ء کی بات ہے۔ یہ سکول پانچ کمروں پر مشتمل تھا اور اس پر سرخ رنگ کیا گیا تھا کہ اس دور میں کارپوریشن یا دیگر سرکاری سکولوں پر یہی رنگ کیا جاتا تھا۔ یہ سکول مین سانده روڈ پر حق آرتھو پیڈک کے قریب واقع تھا۔ اس دور کے کیا خوبصورت استاد تھے جو بچوں کو بڑی ہی محنت سے پڑھایا کرتے۔ انکی تنخواہیں تو معمولی ہوتی تھیں لیکن ان میں پڑھانے کا ایک جذبہ ہوا کرتا تھا۔ میں تو خیر گھر سے کچھ نہ کچھ فارسی اور اردو حروف تہجی پڑھ کر گیا تھا لیکن وہ بالکل نئے بچوں پر بھی بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔

میں کچی جماعت میں داخل ہوا تو اساتذہ نے تین ماہ تک مسلسل ہمیں صرف پہاڑے یاد کروائے۔ ہم صبح ہی صبح باآواز بلند ''اک دونی دونی۔ دو دونی چار'' شروع کر دیتے تھے۔ پہاڑے باآواز بلند اور باجماعت پڑھے جاتے تھے۔ ان تین ماہ میں ہمیں سولہ تک پہاڑے یاد کروائے گئے جو ساری زندگی کے لیے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے۔ ہماری کچی جماعت کے ایک ٹیچر سید تھے۔ جب وہ کمرہ جماعت میں داخل ہوتے تو ساری جماعت کھڑی ہو جاتی تھی۔ سید صاحب بھی عجیب سحر طراز شخصیت کے مالک تھے۔ ہم بچے انہیں بار بار دیکھا کرتے۔ انہوں نے بالکل سفید اور اجلا لباس پہنا ہوتا تھا، ان کی مونچھیں بڑی طرح دار اور ''ٹھسے دار'' تھیں۔ رنگ گورا چٹا تھا اور وہ حقہ بہت زیادہ پیتے۔ جب وہ کلاس میں آتے تو اپنی کرسی کے دائیں ہاتھ اپنا حقہ رکھتے، اس کی نَے منہ سے لگاتے اور پھر ہمیں پہاڑے یاد کروانا شروع کر دیتے۔ وہ کرسی پر ٹانگیں لٹکا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ دونوں پاؤں کرسی پر رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ کش بھی لگاتے جاتے اور پہاڑے بھی یاد کرواتے جاتے۔ ہماری اردو اور پھر پہاڑوں میں جو کسر رہ گئی تھی اسے شاہ صاحب نے پورا کر دیا تھا۔ (اللہ ان کی قبر پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین) پھر ہم دوسری جماعت میں آئے اور ہماری جو حساب (میتھ) میں کمزوریاں تھیں وہ ہمارے استاد ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے دور کروا دیں۔ تیسری اور چوتھی جماعت کے استاد گرامی کا نام ماسٹر شہاب الدین تھا۔ جب میں چوتھی کا امتحان دے چکا تو کسی نے میرے والد صاحب سے کہا آپ شفیق الرحمٰن کو حافظ قرآن کیوں نہیں بنا دیتے، لہٰذا 1964ء کے اواخر میں مجھے سکول سے اٹھوا کر نیلا گنبد (انارکلی کے قریب) مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔ (یاد رہے کہ جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن فیروز پور روڈ جو کہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ کا قائم کردہ ادارہ ہے اس کی بنیاد یہی نیلا گنبد والا مدرسہ تھا۔ اس وقت نیلا گنبد میں گھڑیوں کی مشہور زمانہ دکان ''الانہ واچ کمپنی'' ہوتی تھی ہم اس گلی سے داخل ہو کر مدرسہ میں جایا کرتے۔ میں جن قاری صاحب کے پاس داخل کروایا گیا انہوں نے امرتسر میں میرے والد صاحب سے ناظرہ قرآن پاک پڑھا تھا۔ اب والد صاحب نے انہیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کہا کہ میں نے تمہیں پڑھایا تھا تو اب تم میرے اس بچے کو حافظ قرآن بنا دو تا کہ ہمارا حساب کتاب برابر ہو جائے۔ میں اس سے قبل ناظرہ قرآن پاک اپنے والدین سے پڑھ چکا تھا۔ میرے استاد حافظ صدیق صاحب نے مجھے اس قدر توجہ اور انہماک سے پڑھا یا کہ جب 65ء میں جنگ ہوئی تو میں ستائیس پارے حفظ کر چکا تھا اور 1966ء کے اوائل میں مجھے قرآن پاک مکمل حفظ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میرے والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں اپنی منزل اچھی طرح پکی کروں۔ اللہ میرے ان استاد محترم کو غریق رحمت فرمائے کہ اس شہر لاہور میں بلا مبالغہ اور بلاخوف تردید ان کے کم از کم چار پانچ ہزار شاگرد ہوں گے جنہوں نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا۔ حافظ صدیق صاحب انتہائی سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ جب بھی وہ کسی طالب علم میں سستی، کاہلی یا پڑھائی میں عدم دلچسپی دیکھتے تو ان کا رویہ انتہائی سخت ہو جاتا۔ آج کل تو کہا جاتا ہے کہ ''مار نہیں، پیار'' لیکن استاد محترم کہتے تھے میرا تجربہ ہے کہ پیار سے قرآن پاک حفظ نہیں کیا جاتا اس میں ہمیں تھوڑی تھوڑی مار بھی ضرور شامل کرنا پڑتی ہے اس لیے وہ کبھی کبھار بید کا استعمال بھی فرماتے۔ مجھے یاد ہے جب میں بائیسواں پارہ حفظ کر رہا تھا تو میں اپنا سبق یاد نہ کر سکا تو انہوں نے میری کمر پر دو بید رسید کیے۔ ان کے پاس اوریجنل اور ''اصیل نسل'' کا بید ہوتا تھا جو کمر پر پڑتا تو درد کے مارے برا حال ہو جاتا۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور اس سے اگلے دن جمعہ کی چھٹی تھی۔ جب والدہ صاحبہ مجھے نہلانے لگیں اور انہوں نے میرا کرتہ اتارا، میری کمر پر نشان دیکھے تو ان کی ممتا تڑپ اٹھی اور والد صاحب سے کہنے لگیں: میں نے اب اپنا بچہ قاری صاحب کے پاس ذبح ہونے کے لیے نہیں بھیجنا۔ والدہ محترمہ میرے والد صاحب سے کہنے لگیں، دیکھیں حافظ صدیق صاحب آپ کے شاگرد ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے آپ کے بیٹے پر اس قدر ''ظلم'' ڈھایا ہے اور کچھ خیال نہیں کیا۔ والد صاحب نے جواب دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں میں کل شفیق الرحمٰن کے ساتھ ان کے استاد کے پاس جاؤں گا اور آپ کے جذبات بھی ان تک پہنچاؤں گا۔

خیر، اگلے دن والد صاحب میرے ساتھ گئے اور انہوں نے استاد سے ایک روایتی جملہ کہا جو ماضی میں ہر باپ اپنے بچوں کے استاد سے کہتا تھا۔ یعنی جب کوئی باپ اپنے بچے کو کسی استاد کی ''تحویل'' میں دیتا اور استاد کے سامنے بچے کا زانوئے تلمذ تہ کرواتا تو اس کو ایک جملہ ضرور کہتا تھا کہ میں اپنا یہ بیٹا آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ آپ نے اس کو قرآن پاک حفظ کروانا ہے۔ اس کا گوشت آپ کا ہے اور ہڈیاں ہماری۔ یعنی آپ جتنی بھی سزا دیں کوئی مسئلہ نہیں۔ چنانچہ جب والد صاحب میرے ساتھ گئے تو بجائے اس کے کہ والدہ کا احتجاج ان تک پہنچاتے، انہوں نے الٹا استاد صاحب سے پنجابی زبان میں کہا: ''جناں مرضی مارو بچے نوں جی۔ تسی ایسدے استاد او۔ بچے نوں مارنا تہاڈا استحقاق اے۔ شفیق الرحمٰن کی کیا مجال ہے کہ یہ سبق یاد نہ کرے۔''

میری ناز برداری

جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا تو والد صاحب میرا بہت زیادہ خیال رکھتے اور مجھ پر خوب خرچ کرتے کہ گویا میں ان کے نزدیک ''سی ایس ایس'' کر رہا تھا۔ وہ اپنے لیے اس کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اس دور میں باپ جس بچے کو

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

قرآن پاک حفظ کرواتا تھا اس کو گھر میں وی وی آئی پی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی فل پروٹوکول ملتا۔ ابھی میں نے صرف ایک پارہ ہی حفظ کیا تھا کہ مجھے گھر میں حافظ صاحب کہہ کر پکارا جانے لگا۔ یہ دراصل مجھے والد صاحب کی طرف سے ترغیب اور شوق دلانے کا ایک طریقہ تھا۔ پہلے وہ مجھے اپنی سائیکل پر مدرسے چھوڑنے جایا کرتے، جب مجھے ایک سال مکمل ہوگیا تو مجھے ایک نئی سائیکل لے دی۔ اس دور میں سائیکلوں کی ایک مشہور ایگل کمپنی تھی جس نے بچوں کے لیے خاص طور پر ایک نئی سائیکل متعارف کروائی تھی تو والد صاحب نے مجھے وہ سائیکل لے کر دی۔ اس زمانے میں وہ سائیکل سات سو روپے کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ اس وقت مارکیٹ میں سائیکل کا بہترین برانڈ تھا۔ میں گھر سے مدرسے کے لیے 2 ٹائم جایا کرتا: ایک صبح سویرے جاتا اور دوپہر کو لوٹتا اور دوسرے ظہر کی نماز کے بعد اور مغرب کے وقت گھر واپسی ہوتی۔

میں گھر کے قریب راج گڑھ چوک میں پہنچتا تو والد صاحب چوک میں کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوتے۔ مجھے گھر لاتے اور راستے میں پوچھتے کیا کچھ کھانا ہے؟ اس زمانے میں ابھی تک ''کوک''، ''پیپسی'' اور دیگر کولڈ ڈرنکس کا رواج نہیں پڑا تھا اور مقامی کمپنیوں کی بنی ہوئی ''ٹھاہ ٹھاہ'' والی بوتلیں چلتی تھیں۔ والد صاحب مجھے بوتل پلاتے یا پھر مجھے دودھ والی دکان پر لے جا کر کڑاہی والا گرم گرم دودھ پلاتے اور دکان دار سے کہتے، دودھ میں اچھی خاصی ملائی ڈالنا کیونکہ میرا بچہ حفظ کر رہا ہے۔ ہم عام طور پر جس دکان سے روزانہ دودھ پیتے اس دکاندار کا نام ''باٹی'' تھا جو پورے علاقہ میں مشہور تھا۔ گھر میں میری دیسی گھی سے خاطر تواضع کی جاتی۔ اس وقت یعنی 64-1963ء میں ڈالڈا گھی کی طرف سے ڈالڈا گھی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ہمارے گھر میں زیادہ تر دیسی گھی ہی استعمال کیا جاتا۔ چونکہ والد صاحب خود دکان کرتے تھے تو وہ خالص دیسی گھی مزنگ کی ایک معروف دکان ''خان دی ہٹی'' سے لایا کرتے۔ ان کا دیسی گھی لاہور بھر میں مشہور تھا۔ اس پورے علاقے یعنی سمندہ، سلت نگر، کرشن نگر، شام نگر، پریم نگر وغیرہ میں ''خان دی ہٹی'' کی دیسی گھی کی ایجنسی ایک طرح سے میرے والد صاحب کے پاس تھی۔ والد صاحب والدہ کو کہا کرتے تھے: شفیق الرحمٰن کو سالن میں زیادہ دیسی گھی ڈال کر دیا کرو۔ اسی طرح والد صاحب میرے لیے بادام وغیرہ کا خوب اہتمام کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت لوگ اپنے بچوں کو ایم فل یا پی ایچ ڈی کروانے کے لیے اتنے پیسے خرچ نہیں کرتے تھے جتنا میرے والد محترم نے مجھے حافظ بنانے کے لیے کیے۔ دراصل یہ ان کی قرآن کریم سے بے پناہ محبت اور عقیدت کا ایک اظہار تھا۔

جب میں نے قرآن کریم حفظ کر لیا اور ایک سال مزید لگا کر منزل بھی پکی کر لی تو میں نے 1967ء میں شاہ عالمی میں واقع ایک پرائیویٹ سکول جس کا نام ''انارکلی کالج'' تھا، میں داخلہ لے لیا۔ وہاں میرے ایک ماموں حسن جاوید پڑھایا کرتے تھے جو بعد میں بحیثیت ایڈیٹوریل ایڈیٹر نوائے وقت کراچی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ سجاد میر صاحب کے ساتھ بھی کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے کہانیاں بھی بہت لکھیں جو اپنے وقت کے ممتاز جریدے ''سب رنگ'' میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے میرے متعلق کہا، اب تو آپ کو آٹھویں جماعت میں ہونا چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے میرا داخلہ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آٹھویں میں کروادیا اور تیاری بھی شروع کروادی۔ سچی بات ہے کہ میں نے گلستان و بوستان تو اپنی والدہ سے پڑھ لی تھیں اور ''پندنامہ عطار'' کے چیدہ چیدہ شعر بھی مجھے ازبر تھے۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ کے جو نثری جملے تھے وہ بھی مجھے یاد ہو گئے تھے۔ میں گھر میں جو زیادہ تر اپنی والدہ سے ایک جملہ سنتا تھا وہ تھا: ''خوئے بدرا بہانہ بسیار است''۔ اسی طرح پنجابی کے اکھان اور کہاوتیں بھی والدہ صاحبہ کو بہت یاد تھیں۔ میں نے پنجابی کہاوتیں یا تو اپنی ماں سے سیکھیں یا پھر بعد میں ریڈیو پاکستان کے معروف پنجابی پروگرام 'جمہور دی آواز' کے چوہدری نظام دین سے۔ وہ بڑے ٹھیٹھ پنجابی جملے بولتے تھے جو میرے حافظے میں نقش ہو گئے۔ میں نے حفظ کے بعد مڈل کی تیاری کرتے ہوئے پہلی بار انگریزی سیکھنا شروع کی۔ ہمیں انگریزی پڑھانے والے ایک بڑے ہی باکمال ٹیچر تھے یونس مسیح، وہ بعد میں واشنگٹن گئے اور وہاں انگریزوں کو انگریزی پڑھانے لگے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا انگریزی پر کتنا عبور ہوگا۔ نگینہ سینما لاہور کے ساتھ ایک چرچ ہے جس کے ''فادر'' ان کے قریبی عزیز تھے۔ یونس مسیح چرچ کی خانقاہ میں رہا کرتے۔ وہ بہت ہی پیار سے بچوں کو پڑھاتے اور اگر کسی بچے کو سبق نہ آتا اور سکول ٹائم ختم ہو جاتا تو وہ چرچ میں بچوں کو اپنے پاس بلا لیتے کہ یہاں بیٹھ کر سبق یاد کر لو۔ سر یونس مسیح نے ہمیں پہلے ہی دن یہ سمجھایا تھا کہ اگر آپ نے انگریزی سیکھنی ہے تو پہلے اپنی بنیادیں مضبوط کرو۔ اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ کو سمال لیٹر اور کیپیٹل لیٹرز کے استعمال کا پتا ہو۔ جتنے بھی ہیلپنگ ورب تھے، از، آر، ایم، واز، وَر، ہیو، ہیز، ہیڈ،، ووڈ، شوڈ، کڈ،، مے، مائٹ، مسٹ' ڈو، ڈڈ، ڈز۔ وغیرہ اور ایکٹو وائس، پیسو وائس، ڈائریکٹ، ان ڈائریکٹ' غرض یہ سب کچھ انہوں نے ہمیں چند دنوں ہی میں یاد کروا دیے تھے۔

یونس مسیح صاحب نے گریمر کے بنیادی قواعد ہمیں ڈیڑھ سال میں مکمل طور پر سکھا دیے۔ پھر انہوں نے ہمیں جملوں کی ماڈل کنسٹرکشن بھی بتائی تھی۔ انہوں نے یہ بتایا کہ 'کین' کہاں استعمال ہوتا ہے اور 'مے' کہاں استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے ہماری بنیادیں اس قدر مضبوط کی تھیں کہ مجھے انگریزی پر جو عبور ہے، یہ انہی استادِ محترم کا کمال ہے۔ اسی طرح انہوں نے جملوں کی ٹرانسلیشن کا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ خیر، میں نے آٹھویں کا امتحان دیا اور سب سے زیادہ نمبر میرے انگریزی میں آئے۔ پھر 1969ء میں میٹرک کرنے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن (لاہور) میں داخل کروا دیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ابھی تک بچوں کو ''ٹینس'' ہی سکھائے اور پڑھائے جا رہے تھے۔ استاد استاد ہوتا ہے وہ بھلے کرسچن ہو، ہندو ہو یا مسلمان، مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا۔ کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ ''جو مجھے ایک حرف بھی سکھا دے وہ میرا آقا ہے اور میں اس کا غلام ہوں وہ چاہے تو مجھے آزاد کر دے اور چاہے تو مجھے فروخت کر دے''۔ اب اس طرح بچپن ہی سے ہمارے ذہن میں استاد کا مقام اور مرتبہ بیٹھا ہوا ہے اور میں آج بھی اپنے استادِ محترم سر یونس مسیح کو بہت یاد کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے بتایا گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن میں ابھی ٹینس ہی سکھائے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے اساتذہ سے کہا کہ یہ جو آپ پڑھا رہے ہیں یہ تو ہم آٹھویں جماعت میں پڑھ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

چکے ہیں۔اس پر اساتذہ نے کہا کہ ہم آپ کا امتحان لیتے ہیں۔اساتذہ مجھ سے مشکل سے مشکل جملہ بھی پوچھتے تو میں فوراً جواب دے دیتا۔میں نے ان اساتذہ سے کہا کہ ٹینسز میں گفتگو کے 12 بنیادی طریقے بتائے جاتے ہیں لیکن جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو اس میں ہم صرف 12 طریقوں اور قرینوں سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ گفتگو کے سینکڑوں ''شیڈز'' ہوتے ہیں۔اب میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میں سینکڑوں شیڈز میں گفتگو کرسکتا ہوں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بیسیوں شیڈز میں گفتگو کرسکتا ہوں۔ بہرحال میری انگلش پر اس درجہ کمانڈ سے اساتذہ بہت متاثر ہوئے۔

میں نے مارچ 1971ء میں میٹرک کا امتحان 619 نمبر لے کر گورنمنٹ ہائی سکول چوبرجی گارڈن سے پاس کیا۔یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جب میں میٹرک کررہا تھا تو میری والدہ کا کہنا تھا کہ میں پڑھتا تو ہوں نہیں اور یونیورسٹی گراؤنڈ میں جاکر درختوں سے شہتوت توڑ کر کھاتا رہتا ہوں اور گھر آکر کہتا ہوں کہ میں وہاں گراؤنڈ میں مطالعہ کر کے آیا ہوں لیکن جب 619 نمبر آئے تو وہ بھی حیران رہ گئیں۔میرے آرٹس کے مضامین تھے، سب سے پسندیدہ انگلش اور اردو تھے۔میرا ذہن شروع ہی سے حسابی کتابی نہیں تھا اس لیے میتھ میرے لیے سب سے بور مضمون رہا۔میں جس سبجیکٹ سے بہت ڈرتا تھا، بدکتا تھا اور لرزاں و ترساں رہتا تھا وہ یہی ''میتھ'' تھا۔مجھے زمانہ طالب علمی میں صرف دو بید رسید ہوئے جو میرے استاد محترم حافظ محمد صدیق صاحب نے رسید کیے تھے اور ایک چھڑی مجھے قاری یعقوب صاحب نے رسید کی تھی جو میرے میتھ کے ٹیچر تھے۔یعقوب صاحب کلین شیو تھے لیکن وہ قاری کہلاتے تھے،ان کی آواز بہت اچھی تھی۔اس کے علاوہ اپنی پوری تعلیمی زندگی میں مَیں نے کبھی کسی استاد سے مار نہیں کھائی۔میرا یہ خیال ہے کہ یہ صرف قرآن پاک ہی کا اعجاز تھا کہ قرآن پاک حفظ کرلینے کے بعد میرا حافظہ اس قدر تیز ہوا کہ میں جو بھی لفظ ایک بار پڑھ لیتا وہ حفظ ہو جاتا۔

خطابت کا رجحان

سکول میں جو ہفتہ وار بزم ادب ہوتی تھی اس میں گفتگو کرنے کے لئے ہر ہفتے مجھے کوئی نہ کوئی موضوع دیا جاتا، میں اس زمانے میں بھی تشبیہات اور استعارات کا بہت استعمال کرتا تھا۔اردو پڑھنے اور گفتگو کرنے میں مجھے والدین کی گفتگو اور ان کی لائبریری سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔میرے والدین کے ذوق علم کا اندازہ لگائیے کہ ان دونوں ہستیوں کی گھر میں الگ الگ لائبریری تھی۔والد صاحب مجھے کہتے کہ دیکھو یہ ابوالکلام آزاد کی سب سے آسان کتاب ہے ''غبار خاطر'' اس کو ذرا پڑھ کر سناؤ۔میں ''غبار خاطر'' پڑھ کر انہیں سناتا اور پھر والد صاحب وہ کتاب لے کر خود پڑھتے تھے اور بتاتے تھے کہ فلاں لفظ کا صحیح تلفظ یہ ہے۔مولانا آزاد کے تذکرے سے یاد آگیا کہ انہوں نے غبار خاطر میں اردو زبان کو اس قدر شگفتگی کے ساتھ مفرس اور معرب کیا ہے کہ یہ ان کی ایک مجتہدانہ کاوش بن گئی ہے۔مجھے گھر کے ماحول میں جن ادیبوں کو سب سے پہلے پڑھنے کا موقع ملا ان میں شیخ فریدالدین عطارؒ، شیخ سعدیؒ اور مولانا رومؒ کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔میں نے اردو پڑھنے کا آغاز ہی مولانا آزاد سے کیا۔گھر میں نوائے وقت آتا تھا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اوراس وقت جن کالم نگاروں کو میں نے مستقل پڑھا ان میں ''میم شین'' اور وقار انبالوی نمایاں تھے۔اسی زمانے میں عطاء الحق قاسمی نے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ چونکہ ان کے کالموں میں اکثر ہدف تنقید ذوالفقار علی بھٹو ہوتے تھے تو ہم اس لیے بھی ان کا کالم شوق سے پڑھتے تھے کہ ہم پہلے ہی دن سے اینٹی بھٹو بھی تھے اور اینٹی پی پی بھی۔

والد صاحب گھر میں بیٹھ کر بآواز بلند مولانا رومیؒ کی مثنوی پڑھا کرتے اور ان کے اشعار ہمارے کانوں میں ہر وقت پڑتے رہتے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک طالب علم کتاب دیکھ کر اتنا نہیں سیکھ سکتا جتنا وہ ایک کامل اور مشفق استاد کی زبان سے سیکھتا ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے زیادہ اپنے کانوں سے پیار کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب وحی کا نزول ہوتا۔تو فرشتہ پیغمبر کے کانوں میں آکر آواز ڈالتا تھا جس کا القادل میں ہوتا تھا۔جب آپ پوری توجہ اور انہماک سے کوئی بات سنتے ہیں تو وہ حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔بچپن، لڑکپن اور کہولت تک میں والد صاحب کو دیکھتا رہا کہ وہ رات کے دو بجے بھی مطالعہ میں مستغرق ہوتے۔میں والد صاحب کے کمرے میں سوتا تھا۔ان کے کمرے میں صرف دو چارپائیاں ہی لگی ہوتی تھیں ایک میری اور دوسری والد صاحب کی۔ باقی بچے ان کے کمرے میں اس لیے نہیں سوتے تھے کہ ابا جی کے کمرے کی لائٹ ساری رات جلتی رہتی اور انہیں نیند نہیں آتی تھی۔کبھی میں دیکھتا کہ والد صاحب تفسیر ابن کثیر پڑھ رہے ہیں اور کبھی تفسیر مظہری، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، الاتقان فی علوم القرآن پڑھ رہے ہیں۔ان مشکل کتابوں کے نام بچپن ہی سے میری لوحِ ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔ جبکہ میں ان کا متن بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔تفسیر حقانی اردو میں ہے اور اس تفسیر جیسی ڈکشن اردو کی بڑی بڑی ادبی کتابوں میں بھی نہیں۔ آپ اس تفسیر کو محض ''مولویانہ طرز تحریر'' قرار دے کر مسترد نہیں کر سکتے۔ یہ تفسیر پورا ادیبانہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں جو ادیبانہ آہنگ کی حامل تفاسیر ہیں ان میں ایک مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تفہیم القرآن، دوسری پیر کرم شاہ الازہریؒ کی ضیاء القرآن اور تیسری تفسیر حقانی ہے۔میرے خیال سے ان تینوں تفاسیر میں تفسیر حقانی کو پہلا نمبر دینا چاہیے۔

میرے متعلق لوگوں کا کہنا ہے کہ مَیں شستہ، شگفتہ اور نستعلیق اردو لکھتا اور بولتا ہوں۔ یہ میرا اپنا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔بعض طنزیہ طور پر کہتے ہیں کہ حافظ شفیق الرحمٰن کی تحریر پڑھتے ہوئے ہمیں بعض اوقات ڈکشنری سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی تحسین کا پہلو شامل ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہہ کر طنز کرتے ہیں کہ حافظ صاحب متروک اردو لکھتے اور بولتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے کہ میں متروک اردو کو زندہ کر رہا ہوں۔اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے، جتنے منہ اتنی باتیں۔

اسلامیہ کالج کے سنہرے دن

بہر حال میں اپنی تعلیم کا ذکر کر رہا تھا کہ 1971ء میں مَیں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور چلا گیا۔ یہاں دلچسپی کی بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ جماعت اسلامی کے سینئر راہنما انور گوندل صاحب جو زمانہ طالب علمی میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم رہے تھے۔ان سے والد صاحب نے میرے داخلے کے متعلق مشورہ لیا تو انہوں نے اس خیال سے مجھے اسلامیہ کالج میں داخل کروا دیا کہ ان دنوں اس ادارے میں جمعیت

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی پوزیشن خاصی کمزور تھی اور وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید یہ لڑکا اس ادارے میں جمعیت کا ''سرگرم'' کارکن ثابت ہوگا۔ لہذا گوندل صاحب نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت مجھے اس کالج میں داخل کروادیا کہ یہ لڑکا بڑے کام کا ہے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ آرٹس کا جو میرٹ تھا وہ 617 تھا جبکہ میرے 619 نمبر تھے۔ یہ مجھے تین چار سال بعد پتا چلا کہ میرے ساتھ کیا ''ہاتھ'' کیا گیا اور مجھے کیوں وہاں داخل نہیں کروایا گیا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں جو دوست مجھے سب سے پہلے ملے وہ حسین ثاقب تھے، وہ کالج کی بزم ادب کے صدر تھے۔ وہ مشہور رسالے ''حکایت'' کے ایڈیٹر اور ممتاز ادیب عنایت اللہ مرحوم کے داماد ہیں۔ اس بزم ادب کے نگران اور تربیت کار پروفیسر حمید کوثر صاحب تھے۔ انہیں شاعرِ نظریۂ پاکستان، حفیظ ثانی اور فردوسیِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ میں نے ایک دن کالج کے حبیبیہ ہال کے نوٹس بورڈ پر ایک اعلان پڑھا کہ بزم ادب کے زیر اہتمام ایک تحریری مقابلہ ہو رہا ہے اور جو طالب علم اس میں ٹاپ کرے گا اس کو بزم ادب کا جنرل سیکرٹری بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا مضمون لکھا اور جمع کروادیا۔ مضمون کا عنوان تھا: ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے''۔ بزم ادب کے ایڈیٹوریل بورڈ نے میرا مضمون پاس کیا اور مجھے بزم کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ جب میں نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اجلاس کنڈکٹ کرنا شروع کیے تو مجھ پر ایک نئی حقیقت منکشف ہوئی کہ میں تو گفتگو اور تقریر بھی کر سکتا ہوں۔ حسین ثاقب صاحب نے مجھے خوب راہنمائی فراہم کی۔ وہ کہا کرتے تھے، آپ فی البدیہہ اتنی پیاری بات کہہ دیتے ہو کہ کوئی ادیب ایسا جملہ سوچ سوچ کر بھی ادا نہیں کرسکتا۔ یہ آپ کے لیے خصوصی عطیہ خداوندی ہے اس لیے آپ محنت کریں اور اس اہلیت کو مزید نکھاریں۔

ویسے تو گھر سے سکول و کالج تک اور پھر خطابت اور صحافت کے میدان تک میرے اساتذہ کرام کی فہرست طویل ہے جن سے میں نے کسب فیض کیا۔ تاہم زمانہ طالب علمی میں میری ان صلاحیتوں کو جن دو عظیم شخصیات نے مہمیز دی اور میری آتش شوق کو بڑھانے میں نہایت کلیدی کردار ادا کیا وہ یہی پروفیسر حمید کوثر اور حسین ثاقب تھے۔

میرے دیگر اساتذہ میں واصف علی واصفؒ، ڈاکٹر مسکین علی حجازی اور آغا شورش کاشمیری سرفہرست ہیں۔ پروفیسر حمید کوثر صاحب کو پاکستان کے قومی ترانہ کے خالق اور فردوسی اسلام حفیظ جالندھری رحمہ اللہ علیہ نے اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا۔ حفیظ جالندھری کی صرف بیٹیاں ہی تھیں۔ حمید کوثر کے بیٹے مجید غنی آج بھی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ یہ کالج میں مجھ سے جونیئر تھے۔ بہرحال بزم ادب کے زیر اہتمام کالج کے جو بھی پروگرام ہوتے حمید کوثر صاحب بڑے بڑے شعرا اور ادیبوں کو بلاتے۔ ہم نے بزم ادب کے ان پروگراموں میں جن بڑے لوگوں کو بلایا اور ان سے ان کی شاعری سنی، ان کی تقریریں سنیں اور ان کا فکر و فن ہمارے سامنے آیا ان میں ابو الاثر حفیظ جالندھری، احسان دانش، عبدالعزیز خالد (کمشنر انکم ٹیکس)، قتیل شفائی، پروفیسر مرزا منور، پروفیسر خالد بزمی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ اسی طرح اس دور میں جو نئے نئے شعرا سامنے آرہے تھے اور بعد میں بہت مشہور ہوئے ان کو بھی ہم اپنے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہاں بلاتے۔ ان میں امجد اسلام امجد تھے، یونس احقر جو کہ پنجابی کے ایک بڑے شاعر تھے ان کو بھی بلایا، ایم اے او کالج کے ایک پروفیسر تھے عارف عبد المتین جو کہ اردو ادب میں تنقید کا ایک بہت بڑا نام ہے، یہ بھی بزم ادب میں آتے۔ گویا فرسٹ ایئر ہی میں میرا رابطہ حسین ثاقب صاحب اور پروفیسر حمید کوثر جیسی عظیم شخصیات کے توسط سے جید قسم کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے ہو گیا تھا۔

حضرت واصف علی واصفؒ کی شفقتِ بے پایاں

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ حضرت واصف علی واصفؒ میرے باقاعدہ استاد تھے۔ واصف صاحب نے نابھہ روڈ لاہور میں "لاہور انگلش کالج" کے نام سے ایک ٹیوشن سنٹر قائم کر رکھا تھا جس میں وہ خود طالب علموں کو پڑھایا کرتے۔ میں بھی ان کے پاس 1976ء میں انگریزی پڑھنے کے لیے گیا۔ واصف صاحب کلاس میں آتے تو کہتے کہ آج میں نے آپ کو فلاں انگریزی شاعر کی فلاں نظم پڑھانا ہے اور پھر وہ کتاب دیکھے بغیر معروف انگریزی شعرا ورڈز ورتھ، کیٹس، بائرن، شیلے وغیرہ کے اشعار سنایا کرتے۔ اس دور میں بی اے کے نصاب میں A book of verses underneath the bough تھی۔

واصف علی واصف 1980ء تک نابھہ روڈ پر رہے، تب تک میں باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ انہوں نے حلقہ تصنیف ادب کے نام سے ایک ادبی تنظیم بھی قائم کی تھی۔ اس تنظیم کے اجلاس الشجر بلڈنگ نیلا گنبد میں منعقد ہوتے اور میں باقاعدہ وہاں جایا کرتا۔ اس میں امجد اسلام امجد، ازہر درانی، اسلم کمال، تبسم رضوانی، ثمر اکبر آبادی، حفیظ تائب و دیگر بہت سے حضرات آیا کرتے۔ ازہر درانی ممتاز صحافی مولانا مرتضی احمد خان میکش کے پوتے تھے۔ "شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے"۔ یہ معروف شعر ازہر درانی ہی کا ہے۔

جنابِ واصف علی واصفؒ کی کلاس میں میرا رول نمبر 9 تھا اور وہ ہر طالب علم کو نام لے کر نہیں اس کے رول نمبر سے پکارتے۔ مثلاً مجھے کہتے تھے کہ "مسٹر نائن" ادھر آؤ۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ بھائی تمہارے نام کے ساتھ حافظ لکھا ہے کیا تم واقعی حافظ ہو یا ویسے ہی شوقیہ طور پر لکھا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ الحمدللہ حافظ قرآن ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اچھا تو پھر مجھے سورہ مزمل سناؤ۔ ابھی میں نے کچھ ہی آیات تلاوت کی تھیں کہ فرمانے لگے ٹھیک ہے، تم واقعی حافظ ہو۔ اسکے بعد انہوں نے اپنے میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا اور میری ٹیوشن فیس جو ان دنوں تین سو روپے ماہانہ تھی مجھے واپس کر دی اور فرمانے لگے کہ میں حافظ قرآن سے فیس نہیں لیا کرتا۔

میں حلقہ اربابِ غالب کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ یہ حلقہ معروف دانش ور سراج منیر نے قائم کیا تھا۔ یہ وہی سراج منیر صاحب ہیں جو نواز شریف کے پہلے دورِ حکومت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سربراہ تھے۔ اس حلقے میں اس وقت کے معروف ادیب اور شاعر شریک ہوتے تھے۔

جاوید ہاشمی کی سنگت

جب میں 1971ء میں کالج پہنچا تو ان دنوں پورے پاکستان کے طول و عرض میں پنجاب یونیورسٹی کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی "بنگلہ دیش

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

نامنظور تحریک'' چلا رہے تھے۔ ہم جاوید ہاشمی کے پرستار تھے اور جہاں بھی جلوس نکلتا ہم وہاں پہنچ جاتے۔ ابھی تک میں باقاعدہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل نہیں ہوا تھا لیکن جاوید ہاشمی کی شعلہ بیانی، ان کی جرات، بہادری اور ان کا حکومتوں کو کو للکارنا، پچھاڑنا اور انتظامیہ کو لتاڑنا' یہ وہ چیزیں تھیں جو میرے ذہن میں جاوید ہاشمی کو ایک رول ماڈل کے طور پر ابھار رہی تھیں۔ چونکہ نویں اور دسویں جماعت کے دوران میں نے نسیم حجازی کے ناول بھی پڑھے تھے تو نسیم حجازی کے ایک ناول میں جو معظم علی ایک کردار ہے یا جو اندلس کا ایک ہیرو بدر بن مغیرہ ہے، میں جاوید ہاشمی کو انہی کرداروں کے روپ میں ایک زندہ کردار تصور کرتا تھا۔ اسی دور میں میرے جاوید ہاشمی کے ساتھ ذاتی تعلقات بنے جو محض ہیلو ہائے تک نہیں بلکہ بہت قریبی تعلقات تھے۔ جاوید ہاشمی پیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بعد میں وہ سجادہ نشین بھی بنے۔ جاوید ہاشمی میں زمانہ طالب علمی میں روایتی پیروں والی بات تھی یا نہیں تھی لیکن ایک بات ان میں ضرور تھی کہ وہ جلدی دوست بنا لینے کا ہنر جانتے تھے۔

مباحثوں میں شرکت

کالج کی تمام ادبی سرگرمیاں کالج کے تاریخی حبیبیہ ہال میں ہوا کرتی تھیں اور میں ان میں خوب حصہ لیتا۔ پروفیسر حمید کوثر نے مجھے کہا کہ آپ کالج کی طرف سے مختلف مباحثوں میں شریک ہوا کریں گے۔ میں بتاتا چلوں کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا حبیبیہ ہال ایک تاریخی ہال ہے۔ یہ ہال افغانستان کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خان کے نام سے منسوب ہے۔ یہ وہ ہال ہے جس میں سرسید احمد خان نے خطاب کیا، اس میں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنا کلام سنایا، اسی ہال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کی تھی۔ جب میں حبیبیہ ہال کے ڈائس پر کھڑے ہو کر تقریر کرتا تو میرے ذہن میں یہ سارا تاریخی پس منظر ابھر آتا اور میں خود پر فخر محسوس کرتا۔ میں تقریر کرنے سے پہلے سوچتا کہ یہ عام سٹیج نہیں ہے لہٰذا مجھے یہاں پر ثقہ قسم کی بات کرنی ہے، کیونکہ یہاں بڑے بڑے علماء، صلحا، ادبا، فصحا، شعرا اور خطبا اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور مجھے ان اکابرین و مشاہیر کے وقار و افتخار اور نام و مقام کا پاس رکھنا ہے۔ لہٰذا اس ہال کے ڈائس پر کھڑے ہونے کے ذوق و شوق میں مجھے کتب بینی کے موروثی میلان اور فطری رجحان کو مزید اجالنا پڑا۔ اس میں میری راہنمائی پروفیسر حمید کوثر، پروفیسر سردار جمیل اور پروفیسر بشیر چٹھہ صاحبان نے کی۔ چٹھہ صاحب بڑے ہی باکمال انسان تھے۔ وہ اردو کے سینئر پروفیسر اور زبردست ادیب تھے لیکن اگر کوئی طالب علم کوئی اچھا جملہ بول دیتا تو وہ اس انداز میں اسے داد دیتے جیسے کسی مشاعرے میں کوئی عام سخن شناس و سخن فہم سامع کسی بڑے شاعر کو داد دیتا ہے۔ یہ انکی خردنوازی تھی، کیونکہ کسی شاگرد کی اہلیت کو نگینے کی طرح تراش دینا ہی کسی استاد کا کمال ہوتا ہے اور یہ کمال ہمارے ان اساتذہ میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کوئلے کی کان سے ہیرا تلاش کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ہیرا نہ صرف تلاشتے بلکہ پھر اسے تراشتے بھی تھے۔

پھر میں نے اساتذہ کے حکم کے مطابق مختلف مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہی دنوں ایسا ہوا کہ میرے والد صاحب کو دکان میں بہت زیادہ خسارہ ہونے لگا اور ہمارے مالی حالات کمزور ہونے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

لگے۔ میں نے کالج کی طرف سے پہلی مرتبہ علی پور میں ایک ڈیبیٹ میں حصہ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ میں حصہ لے رہا تھا، میں ابھی اس میدان میں ''نو وارد'' یعنی تازہ وارد بساطِ خطابت' تھا۔ میں نے اس پروگرام میں تقریر کی اور اس کا رزلٹ جب آیا تو الحمدللہ اس اہم اور پہلی تقریب میں میری دوسری پوزیشن جبکہ پہلی پوزیشن جناب افتخار فیروز کی تھی۔ میری پانچ منٹ کی تقریر تھی جس میں بیسیوں مقررین تھے۔ اس ڈیبیٹ میں پنجاب یونیورسٹی کے مقررین بھی تھے، افتخار فیروز صاحب وہاں موجود تھے۔ اکرم شیخ (سابق اٹارنی جنرل آف پاکستان) اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں زیرِ تعلیم تھے انہوں نے بھی تقریر کی۔ گوجرانوالہ کے ایک ممتاز طالب علم راہنما تھے سلمان کھوکھر انہوں نے بھی تقریر کی۔ یہ آج کل پاکستان کے نامور ایڈووکیٹ ہیں۔ فیصل آباد سے ایک ڈبیٹر تھے عاشق حسین کنگ یہ پنجابی کا ایک لاثانی ڈبیٹر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ان کی طرح کسی کو بھی پنجابی بولتے نہیں دیکھا۔ ہاں شاید سلمان کھوکھر ان کے ہم پلہ تھے۔ یہ اپنے وقت کے بڑے بڑے طالب علم ڈبیٹر تھے جن میں ایک میں بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد میں نے مستقل طور پر ڈبیٹس میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان دنوں کالج فیس صرف چھ روپے تھی اور مجھے کالج کی طرف سے ڈیبیٹ میں جانے کے سو روپے کے قریب مل جاتے تھے۔ اس طرح میں مہینے بھر میں کوئی دس پندرہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتا اور مجھے کسی نہ کسی پوزیشن میں انعامات ملتے رہتے۔ میں تمام مقابلوں میں فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ رہا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس وقت پوزیشنوں سے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ ایک تو میں خود فن تقریر میں ملکہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسرا اس ذریعے سے میری کچھ نہ کچھ آمدنی بھی شروع ہو گئی تھی اور میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ میں اس دور میں ہر ماہ تین چار سو روپے اپنے گھر والوں کو دینے لگا تھا۔

مولانا کوثر نیازی بدمزہ ہو گئے

1973ء میں جب میں نے انٹر کا امتحان دیا تو چونکہ میں ڈبیٹس کے چکر میں زیادہ پڑ گیا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ نہ دے سکا، یوں میری نصابی سرگرمیوں کی لو مدھم پڑ گئی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا الاؤ بہت زیادہ بھڑک اٹھا جس کی وجہ سے اس امتحان میں میری سیکنڈ ڈویژن آئی۔ کالج میں میرے مضامین اکنامکس، جیوگرافی، سائیکالوجی، اردو اور انگلش تھے۔ جب میں تھرڈ ایئر میں تھا تو میری تقریروں کی خوب شہرت ہو گئی۔ انہی دنوں کالج میں یوم اقبال منایا گیا اور اس تقریب کی صدارت اس زمانے کے وزیر اطلاعات ونشریات اور حج واوقاف مولانا کوثر نیازی مرحوم نے کی۔ کوثر نیازی اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب، شاعر اور صحافی تھے۔ ان کی صحافت اور سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی خطابت اور شاعری کے بارے میں اگر کوئی شک کرتا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ:

''ہر چہ شک آرد کافر گردد''۔

مجھے اس موقع پر جو موضوع دیا گیا اس کا عنوان تھا: ''اقبال اور مُلّا''۔ ہمارے وائس پرنسپل عبدالحی نائیک صاحب جو کہ اندرون موچی دروازہ میں پیپلز پارٹی یونٹ کے سرپرست بھی تھے' نے مجھے کہا کہ دیکھو پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اس لیے آپ ذرا مولانا کوثر نیازی صاحب، بھٹو صاحب اور پیپلز

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پارٹی کی تعریف کر دیجیے گا۔ آپ کا موضوع بھی ایسا ہے کہ آپ بھٹو مخالف مولویوں کو آسانی سے رگڑا دے سکتے ہیں۔ میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کہا، جیسے آپ حکم دیں گے ویسی ہی تقریر ہوگی۔ مجھے انتظامیہ کی طرف سے ایک فہرست دی گئی جس میں مولانا مودودیؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مفتی محمودؒ، مولانا عبدالحق حقانی، پروفیسر عبدالغفور اور دیگر علماء جو بھٹو مخالف کیمپ میں تھے ان کے نام تھے کہ آپ نے ان مولویوں کو آڑے ہاتھوں لینا ہے تاکہ مولانا کوثر نیازی خوش ہو جائیں۔ میں نے تقریر شروع کی اور ابتدائیہ میں اقبال کے حوالے سے دو چار جملے کہے۔ مولانا کوثر نیازی اس وقت سٹیج پر موجود تھے اور کسی کے ساتھ محو گفتگو تھے، کیونکہ میرے جیسے طالب علم کی بات کون سنتا تھا۔ پھر مولانا تو خود بہت بڑے خطیب اور سیاستدان تھے۔ لیکن جب میں نے ابتدائی جملے کہے تو میں نے دیکھا کہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے منہ پر انگلی رکھ کر قریب بیٹھے صاحب کو خاموش ہونے کا کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ خاموش رہیں اور اس طالب علم کو سنیں۔ میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اقبال نے جس ملاّ کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ کون ہے؟ ''دین ملاّ فی سبیل اللہ فساد'' یہ ایک مصرع ہے جس کو لے کر دین بے زار لوگ علماء کی عظیم خدمات کو رگید رہے ہیں۔ حالانکہ اقبال بذات خود جس شخص کو اپنا مرشد اور مربی کہتا ہے اس کے نام کا پہلا حصہ ہی مولانا بلکہ ملاّ ہے۔ یعنی مولائے روم۔ لفظ ''ملا'' کو یہاں گالی سمجھا جا رہا ہے حالانکہ فارسی اور عربی لٹریچر میں علم و فضل کی معراج پر پہنچنے والے شخص کو ملا کہا جاتا ہے۔ مثلاً ملا علی قاری اور مولانا روم وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں کہ جن لوگوں کے نام کے ساتھ ملا لکھا جاتا ہے وہ اپنے وقت کے بہت بڑے علماء و مشاہیر تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے جن لوگوں کو عالم ہوتے ہوئے ان کے شخصی تضادات اور سیرت کے دوہرے پن کی بنیاد پر ان کو ہدف تنقید بنایا وہ ان علماء کو بنایا جو ''دربار اکبری'' میں جا کر جی حضوری کرتے اور ملا فیضی، ملا ابوالفضل اور ملا مبارک بن جاتے تھے۔ اقبال نے اس ملاّ کی مذمت کی تھی جو تخت پر بیٹھے براجمان ''ان پڑھ اعظم'' کو ''اکبر اعظم'' کا خطاب دیتے اور ان کی اندھی تعریف و ستائش کرتے اور اپنے دور کے اکبر کے ''نورتنوں'' میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو آج بھی ایسے ملا لوگ موجود ہیں جو اقتدار کی دہلیز پر سجدہ ریز رہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم علمائے حق ہیں اور جو بھی وقت کے حاکم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اس کو ''ملاّ'' کہہ کر اس کی تحقیر و تضحیک کرتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال نے اعلائے کلمۃ الحق بلند کرنے والے علماء کو ''ملاّ'' کہہ کر ہرگز تحقیر نہیں کی۔ لہذا ناقدین حضرات اپنی اصلاح فرمالیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اقبال نے ملا ان کو کہا ہے جن کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ اقبال کا ملا وہ ہے جو ہمیں فائیو سٹار ہوٹلوں کے ہال میں تقریر کرتے ہوئے یہ تو بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ہاں فقر و فاقہ رہتا تھا اور وہ فقر کو اپنی معراج سمجھتے تھے اور خود وہ جس ہال میں تقریر کر رہا ہوتا ہے وہاں ٹیبل پر درجنوں اقسام کے کھانے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ وہ ملا ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ پیوند لگا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے اور وہ خود امپورٹڈ جوتے اور کپڑے پہنتا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہے اور اطلس وحریر اور ریشم و پرنیاں کی قباؤں میں ملبوس ہوتا ہے۔ دراصل اسی تضاد کی وجہ سے لوگ علماء سے دور ہوئے ہیں۔

اب اسے محض اتفاق ہی کہیے کہ مولانا کوثر نیازی صاحب نے کچھ دن قبل ہی پرل کانینٹل ہوٹل میں منعقدہ ایک سیرت کانفرنس میں خطاب کیا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ طالب علم براہ راست مجھ سے ہی مخاطب ہے۔ بہر حال میری تقریر کی عوامی اور طالب علموں کی سطح تک بہت پذیرائی ہوئی اور خوب تالیاں بجائی گئیں۔ میری تقریر 7 منٹ کے بجائے سترہ منٹ ہوئی۔ اس تقریب میں خطاب کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی گئی تھی ان میں ماہر اقبالیات پروفیسر مرزا منور، اس وقت کے بہت بڑے شیعہ عالم خطیب آل محمد سید اظہر حسن زیدی، مسلم مسجد لوہاری کے بانی اور نامور خطیب مولانا محمد بخش مسلم بی اے اور خطیبِ شاہی مسجد مولانا عبد القادر آزاد بھی موجود تھے۔ میری تقریر کے بعد مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ بس اب میں خود تقریر کروں گا اور باقی تمام تقریریں منسوخ ہیں۔ انہوں نے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں پہلا جملہ یہ کہا کہ ادھر آ! میرے نادان دوست! میں تجھے بتاتا ہوں کہ اقبال کا ''ملا'' کون ہے۔ اقبال کا ملا وہ ہے جس نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اقبال کا ملا وہ ہے جس نے قائداعظم کو کافر اعظم کہا۔ اقبال کا ملا وہ ہے جو آج قائداعظم کے بعد سب سے بڑے لیڈر بھٹو کی بھی مخالفت کر رہا ہے..... میری اس تقریر کی دھوم آغا شورش کاشمیری مرحوم تک حمید اصغر نجید اور خواجہ افتخار موحوم نے پہنچائی۔ اور اس زمانے کے معروف کالم نگار جناب رفیق ڈوگر نے اپنے کالم 'دید وشنید' میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔

پیپلز گارڈ کا تشدد

تقریب ختم ہوئی اور میں برف خانہ چوک میں پہنچا (برف خانہ چوک کی بھی اپنی ایک ہسٹری ہے۔ اسے برف خانہ چوک اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں میاں نواز شریف کے والد گرامی میاں محمد شریف مرحوم نے اپنا ایک برف خانہ قائم کیا تھا جس کی وجہ سے اس کا نام برف خانہ چوک پڑ گیا) وہاں پیپلز پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم ''پیپلز گارڈ'' (جو غنڈہ گردی اور فسطائیت کے لیے بنائی گئی تھی) کے غنڈے میرے انتظار میں تھے۔ غنڈوں کا کام تھا کہ جو بھی ان کے قائدین کی توہین کرے اسے نقد و نقد ہی سبق سکھا دیتے تھے۔ اس وقت پیپلز گارڈ کے چیئرمین طارق وحید بٹ تھے۔ یہ وہی طارق وحید بٹ ہیں جنہوں نے بعد میں اپنی سیاسی یادداشتیں ''میری آواز'' کے عنوان سے بھی لکھیں۔ بہر حال پیپلز گارڈ کے پانچ سات افراد نے مجھے گھیر لیا۔ ان میں طارق وحید بٹ اور ذوالفقار زلفی تھے جو بعد ازاں دیال سنگھ کالج میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی بنے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے آپ کے قائدین کو گالیاں ہرگز نہیں دیں اور نہ ان کی کردار کشی کی ہے۔ اسی اثنا میں ایک بندے نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ایک زناٹے دار تھپڑ میرے دائیں کان پر رسید کیا۔ کئی دن تک میرا کان سائیں سائیں کرتا رہا۔ یوں مجھے اس تقریر کے فوری بعد ہی اس کی سزا مل گئی۔

آغا شورش کاشمیری اور مولانا کوثر نیازی کی لڑائی

ہفت روز ''چٹان'' کے ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری اور ہفت روزہ ''شہاب'' کے ایڈیٹر مولانا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کوثر نیازی کے مابین 1970ء کے انتخابات سے پہلے ایک بہت بڑی قلمی جنگ ہوئی تھی۔ اسے مکمل طور پر صحافتی میدان کی ایک قسم کی ''پانی پت کے چوتھی جنگ'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دوران ایسا ہوا کہ ایک روز ٹولنٹن مارکیٹ میں کوثر نیازی اور بطل حریت آغا شورش کاشمیری کا آمنا سامنا ہوگیا۔ آغا صاحب آؤ دیکھا نہ تاؤ مولانا پر یوں جھپٹ پڑے جیسے شکرا تلور پر حملہ آور ہوتا ہے۔ دونوں غصے میں بے قابو تھے۔ دونوں نے دیکھتی آنکھوں ایک دوسرے پر دکانوں پر موجود ڈبے اور بوتلیں اٹھا اٹھا کر چاند ماری شروع کر دی۔ انہی دنوں مولانا کوثر نیازی نے اپنے اخبار ''شہاب'' میں آغا شورش کاشمیری کی کردار کشی کا ایک طولانی سلسلہ شروع کیا ہوا تھا جس کے جواب میں آغا صاحب ''چٹان'' میں جوابِ آں غزل ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے'' کے مصداق لکھا کرتے۔ بعد میں اہم علمی شخصیات نے ان حضرات کی صلح کروائی۔

انتخابی معرکے

انٹرمیڈیٹ کے بعد میں نے اسلامیہ کالج میں گریجوایشن میں داخلہ لے لیا۔ اب یوں ہوا کہ مولانا کوثر نیازی صاحب نے مجھے جس قدر اچھال دیا تھا اس وجہ سے میں اسلامی جمعیت طلبہ والوں کی نظروں میں آ گیا وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ ان حالات میں مجھے بھی ضرورت پڑ گئی کہ میں اپنے تحفظ کے لیے کسی تنظیم کا سہارا لے لوں۔ اس وقت کالج میں تین بڑی سیاسی جماعتوں کے سٹوڈنٹس ونگ موجود تھے۔ ایک پیپلز پارٹی کا پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن، دوسرا کمیونسٹوں کا جو نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے کام کر رہا تھا۔ کمیونسٹ نظریات کے یہ لوگ بھٹو کے ساتھ بھی شامل نہیں ہوئے تھے اور ان کے مخالف تھے۔ البتہ ان کے کچھ لوگ بھٹو کے ساتھ مل گئے جن میں پرویز رشید (سابق وفاقی وزیر اطلاعات) وغیرہ شامل ہیں۔ پرویز رشید این ایس ایف کے بانیوں میں سے تھے اور تیسرا دھڑا اسلامی جمعیت طلبہ کا تھا۔ مجھے جمعیت والوں نے کہا کہ 1969ء کے بعد اس کالج سے جمعیت کامیاب نہیں ہوئی۔ تمام سیٹیں یا تو پی ایس ایف جیت جاتی ہے یا پھر این ایس ایف۔ اب ہم ایک مضبوط پینل سامنے لا رہے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ نائب صدر کے امیدوار آپ ہوں۔ یوں میں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ ان انتخابات میں حصہ لیا اور ایک ایک کلاس میں جا کر تقریریں کیں۔ یہاں پھر میری خداداد خطابتی صلاحیت کام آئی، تقریروں نے اپنا رنگ دکھایا اور مخالفین کی بھرپور مہم کے باوجود میں الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ اب میرے پاس کالج کا ایک پورٹ فولیو تھا، میں لاہور سٹوڈنٹس کونسل کا بھی ممبر تھا۔ یہ کونسل لاہور کی تمام منتخب طلبہ جماعتوں کا ایک اتحاد تھا۔ میں نے تھرڈ ایئر میں آ کر مباحثوں میں اسی طرح حصہ لینا جاری رکھا۔ 1970ء کے بعد چونکہ ہمارا گھرانہ معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا تھا اس لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں مَیں نے اپنی گلی میں موجود چوہدری قطب دین کی بیکری میں سیلز مینی کا کام شروع کیا۔ وہ پورے لاہور میں بند، پیسٹریاں، کیک اور بسکٹ کی سپلائی دیتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کام کروں تو وہ کہنے لگے کہ آپ کے پاس سائیکل ہے تو آ جاؤ اور کام کرو۔ انہوں نے میری سائیکل کے پیچھے لوہے کا صندوق رکھ دیا جس میں تمام بیکری

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کی اشیاء تھیں، یوں میں نے پورے دو مہینے کرشن نگر، راج گڑھ، سمن آباد، شادمان کے علاقوں میں سپلائی دی۔ اس دور میں بھی میں ماہانہ چھ سات سو روپے کماتا تھا۔ اس زمانے میں گریڈ 17 کے افسر کی تنخواہ بھی 600 یا 700 ہی ہوتی تھی۔ اس طرح میں نے گھر کے معاشی بحران پر قابو پانے میں کردار ادا کیا۔

یہاں یاد آ گیا کہ اس سے بھی پہلے جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھا تو میں نے والد صاحب کے حکم پر نہانے والے فوم کی سپلائی کا کام کیا تھا۔ یہ نہانے والے فوم ہماری گلی میں ایک صاحب رہتے تھے وہ بناتے تھے۔ میں نے سمن آباد، شاہ عالمی، گلبرگ مین مارکیٹ میں چار پانچ ماہ تک سپلائی کا کام کیا۔ اس طرح 1974ء میں مَیں نے مباحثوں سے ملنے والے پیسوں اور سیلز مینی کے ذریعے ملنے والے پیسوں سے گھر والوں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ مجھے دیگر نوکریوں سے سیلز مینی زیادہ مناسب لگی کیونکہ یہ ایک تو آزاد کام تھا کہ آپ جب چاہیں سپلائی دے دیں اور جب چاہیں چھٹی کر لیں، اس میں کوئی خاص پابندی والی بات نہیں تھی پھر اس کا معاوضہ بھی اچھا ملتا تھا لیکن بعد میں مَیں اس گھومنے پھرنے والے کام سے بھی اکتا گیا اور دل چاہتا تھا کہ کہیں بیٹھ کر کام کروں۔

محنت مزدوری

جن دنوں میں اسلامیہ کالج میں سٹوڈنٹس یونین کا نائب صدر تھا، میں نے راج گڑھ کے جماعت اسلامی کے ایک صاحب سے بات کی کہ مجھے کوئی کام چاہیے کیونکہ اب سیلز مینی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں عصر کی نماز اکثر ریواز گارڈن میں بیت المکرم مسجد میں پڑھا کرتا تھا۔ پریم نگر اور ریواز گارڈن میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا، ان صاحب سے میری ملاقات اسی مسجد میں ہوئی تھی اور معلوم ہوا کہ وہ بھی جماعت اسلامی کے ہم نوا ہیں۔ ان صاحب کی شیشے کے برتن بنانے والی فیکٹری تھی، انہوں نے مجھے کام پر رکھ لیا۔ یہ فیکٹری چوہنگ میں تھی اور بھٹو صاحب کے اس دور میں یہ بات اچھی تھی کہ طالب علموں کی بس کی ٹکٹ دس پیسے فکس ہو گئی تھی۔ یوں چوہنگ فیکٹری میں آنے جانے کے میرے بیس پیسے لگتے تھے۔ میں روزانہ ماں سے پانچ روپے لے کر جاتا، دوپہر کا کھانا بھی کھاتا اور پھر بھی تین روپے بچا لیتا تھا۔ میں بے فکر تھا کہ میں سیلز مینی میں ماہانہ پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا تو اس فیکٹری میں تو مجھے زیادہ پیسے مل جائیں گے کیونکہ یہ زیادہ مشقت طلب کام تھا۔ جون کی شدید گرمی میں جب سورج کی کرنیں آگ برساتی ہیں اس میں میرا کام یہ ہوتا تھا کہ فاؤنڈری میں جہاں پر شیشہ پگھلتا اور اس کے فلاسک یوں نکلتے تھے جس طرح تندور سے روٹیاں نکالتے ہیں۔ میں اس آگ کے سامنے کھڑے ہو کر گنتی کرتا تھا کہ کتنے فلاسک گر گئے اور کتنے جگ بن گئے اور کتنے گلاس۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں نے ایک ماہ کے بعد تنخواہ طلب کی تو انہوں نے مجھے اکاؤنٹنٹ کے پاس بھیج دیا اور اکاؤنٹنٹ نے ایک رجسٹر میرے آگے کر دیا کہ یہاں دستخط کر دیں۔ میں نے کہا کہ پہلے بتائیں کہ میری تنخواہ کتنی ہے تو اس نے کہا کہ ڈیڑھ سو روپے۔ میں نے کہا کہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ تو میرے یہاں آنے جانے میں خرچ ہو گئے ہیں اور اس قدر محنت کا صرف اتنا معاوضہ دے رہے ہیں۔ یوں اسی دن میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔

1975ء میں دوبارہ طلبہ یونین کے الیکشن ہوئے اور میں یہ الیکشن ہار گیا کیونکہ انہی دنوں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میرے والد صاحب کا علی ہسپتال میں آنکھ کے موتیے کا آپریشن ہوا۔ یاد رہے کہ یہ آپریشن آج کل کی طرح آسان نہ تھا بلکہ اس دور میں موتیے کا آپریشن ایک بہت بڑا آپریشن تھا، کئی دنوں تک مریض ہسپتال میں رہتا اور پھر ایک عرصہ تک اس کی آنکھوں پر سبز پٹی بندھی رہتی۔ لہذا میں الیکشن مہم نہ چلا سکا اور الیکشن ہار گیا۔ 1976ء میں اے جی پی ٹی این ٹی میں سینئر اور جونیئر آڈیٹر کی نوکریوں کے متعلق خبر شائع ہوئی۔ میں چونکہ گریجوایشن کا طالب علم تھا لہٰذا میں نے اپلائی کر دیا۔ میرا ٹیسٹ اور انٹرویو کامیاب ہوا اور مجھے نوکری مل گئی اور نومبر 1976ء میں بطور سینئر آڈیٹر بھرتی ہوگیا۔ اب یہ جتنے بھی اکاؤنٹس کے محکمے ہوتے ہیں وہ اے جی پنجاب ہو یا اے جی پی ٹی اینڈ ٹی ہو وہاں ساری فائلیں جب ''باس ٹو باس'' یا ''ٹیبل ٹو ٹیبل'' آگے بڑھتی ہیں تو ان کے نیچے چاندی کے پہیے لگانے پڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ پہیے آڈیٹر اپنے پاس سے تو نہیں لگا سکتا لہٰذا جو سائل ہوتا ہے اس سے خوب رشوت لی جاتی ہے۔ میرے سپرنٹنڈنٹ رفیق اختر صاحب تھے میں نے ان سے کہا کہ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا تو اس پر انہوں نے کہا کہ بھائی آپ پھر فائلوں کو ہاتھ نہ لگایا کریں کیونکہ اس طرح آپ ہمارا بھی حق ماریں گے۔ یوں میں دفتر وقت پر آجاتا تھا اور آٹھ گھنٹے بیٹھ کر چھٹی کر جاتا اور فائلوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ چند ماہ بعد ہی میں نے یہ پکی سرکاری نوکری بھی چھوڑ دی۔

طالب علم رہنماؤں کی تحریک استقلال میں شمولیت

دسمبر 1976ء میں جاوید ہاشمی نے اسلامی جمعیت طلبہ کو خیر باد کہا تو جماعت اسلامی والوں کا خیال تھا کہ اب وہ جماعت میں باقاعدہ شامل ہو جائیں گے لیکن انہوں نے ایئر مارشل اصغرخان مرحوم کی تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی دور میں راولپنڈی سے شیخ رشید نے بھی تحریک استقلال جوائن کی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک اور قدآور نام تھا حفیظ خان، یہ بھی جمعیت کو چھوڑ کر تحریک استقلال میں آ گئے۔ حفیظ خان انگریزی کے اتنے بڑے ڈیبیٹر تھے کہ میں نے ان کے متعلق ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے تو وزیراعظم بھٹو نے انہیں پیغام بھیجا کہ میں نے آپ کی انگریزی خطابت کی بڑی شہرت سنی ہے اور میں آپ کی تقریر سننے یونیورسٹی آنا چاہتا ہوں تو حفیظ خان نے انکار کر دیا تھا۔ خیر یہ بات تو ایک طرف رہنے دیں میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ حفیظ خان انگریزی زبان کا بہت بڑا مقرر تھا۔ اس زمانے میں تعلیمی اداروں میں صرف دو ہی بڑے ڈیبیٹرز کا نام گونجتا تھا، ایک افتخار فیروز اور دوسرے حفیظ خان۔ جاوید ہاشمی ایک شعلہ بیان اور جذباتی مقرر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ جس مجمع میں بھی کھڑے ہوجاتے اس میں جان ڈال دیتے۔ ان کی آتش بیانی ضرب المثل بن چکی تھی۔

جب دسمبر 1976ء آیا تو جاوید ہاشمی جو کہ زمانہ طالب علمی ہی سے میرے لیے ایک رول ماڈل طالب علم لیڈر تھے۔ ان کی پریس کانفرنس میں نے اخبار میں پڑھی کہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ چھوڑ کر ایئر مارشل اصغر کی تحریک استقلال میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ انہی دنوں یعنی دسمبر 76ء ہی میں ذوالفقار علی بھٹو نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا کہ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

یہ انتخابات مارچ 1977ء کے اوائل میں ہوں گے۔ پھر بھٹو مخالف 9 سیاسی جماعتوں کا قومی اتحاد بن گیا۔ جس میں لیفٹ رائٹ کی تمام سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ مسلم لیگ آفس ڈیوس روڈ لاہور جو کہ صاحبزادی محمودہ بیگم کی ملکیت تھا، وہاں پر قومی اتحاد کا بڑا اہم اجلاس ہوا اور نو جماعتوں نے شرکت کی اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یہ اعلان کیا کہ ہم بھٹو کو برطرف کرنے کے بعد بھی متحد رہیں گے۔

مجیب الرحمان شامی صاحب کے صحافتی معرکے

77ء کے الیکشن کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ جاوید ہاشمی نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ہاشمی صاحب لاہور سے صوبائی نشست پر الیکشن لڑ رہے تھے اور ان کا انتخابی دفتر رانا چیمبر پرانی انارکلی میں واقع تھا۔ یہ عمارت معروف سیاسی شخصیت رانا نذر الرحمٰن کی تھی۔ یہاں پر میں باقاعدہ آتا۔ مجیب الرحمٰن شامی کے رسالے ''اسلامی جمہوریہ'' کا دفتر بھی اسی عمارت میں دوسرے فلور پر ہوا کرتا تھا۔

73ء سے 76ء تک میرا زمانہ طالب علمی تھا اور میں جناب مجیب الرحمان شامی کا ہفتہ وار رسالہ اور آغا شورش مرحوم کا ''چٹان'' باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ ان دنوں چونکہ شامی صاحب اپنے اداریوں اور دوسری تحریروں میں بھٹو حکومت کے خلاف کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے تو اس کے رسالے کے بار بار ڈیکلیریشن ضبط ہوتے رہے۔ ان کے نام تھا: اذان حق، کیل ونہار، اداکار، الحدید، اسلامی جمہوریہ، زندگی رفاقت اور طاہر۔ اب شامی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی ان کا پرچہ تعطل کا شکار نہ ہوا، ان کا ایک ڈیکلریشن منسوخ ہوتا تو دوسرا آ جاتا۔ یہ اس ققنس کی طرح تھے جو اپنی ہی راکھ میں جل کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ شامی صاحب کے پرچوں کی بندشیں اور پیہم منسوخیاں اور ہر منسوخی کے بعد ان کا دوبارہ ایک نئے انداز اور نئے آہنگ سے جوش و جذبے کے ساتھ کسی اور ڈیکلریشن کو لے کر ایک نئے جریدے کا آغاز کر دینا، یہ ان کی میں سمجھتا ہوں کہ ایک خداداد صلاحیت تھی کہ ان کا جو بھی نیا جریدہ آتا وہ لوگوں کے لیے ہرگز نیا نہیں ہوتا تھا۔

دراصل لوگ ان دنوں پڑھنا چاہتے تھے مجیب الرحمٰن شامی کو، بھلے پرچے کا نام ''اداکار'' ہو یا ''رفاقت'' ''اسلامی جمہوریہ'' یا ''طاہر'' اور ''اذان حق''۔ کوئی بھی پرچہ ہوتا لوگ اس کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ جو لوگ حریت فکر سے پیار کرتے تھے اور آزادی اظہار کے ایک پرچم بردار کے طور پر مجیب الرحمٰن شامی کو دیکھتے تھے وہ پرچے کی خریداری ضرور کرتے تھے۔ میرے تصور میں جب یہ سب کچھ آتا ہے تو میں تاریخ کی انگلیاں پکڑ کر ماضی کے میدانوں میں چلا جاتا ہوں اور سچ پوچھیے تو مجھے مولانا ظفر علی خان اور مجیب الرحمٰن شامی ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے 'زمیندار' اخبار کے ڈیکلریشن منسوخ ہوتے رہے اور وہ بار بار جرات اظہار کرنے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ اپنی آزادی و بے باکی سے تمام تر پابندیوں اور جکڑ بندیوں کے باوجود کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ اگر برطانوی ملوکیت کے محافظ ان کی آواز کو دبانا چاہیں یا ان کے ڈیکلریشن منسوخ کر دیں تو وہ دم سادھ کر بیٹھ جائیں اور لب بستہ ہو جائیں۔ ظفر علی خان کا ایک ڈیکلریشن منسوخ ہوتا اور انہیں جرمانہ کیا جاتا تو

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

لاہور کے شہری خود چندہ جمع کر کے یہ جرمانہ ادا کر دیتے۔ یہ جرمانہ ہزاروں روپے میں ہوتا تھا۔ اگر صبح کو ڈیکلریشن منسوخ ہوتا تو شام تک لوگ جرمانہ ادا کر دیتے اور یوں اگلے روز مولانا کا اخبار پھر سے منصۂ شہود پر آجاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب میں اردو صحافت میں جو کردار مولانا ظفر علی خان نے ادا کیا اس کی نقابت، اس کی پیروی اور تتبع اگر کسی نے پامردی اور جگرداری سے 1970ء سے 1977ء تک بدستور کیا تو وہ جناب مجیب الرحمٰن شامی ہی تھے۔ اسی تناظر میں بعض احباب انہیں ظفر علی ثانی بھی کہتے ہیں۔

اب ظفر علی خان کا مقام اور قد کاٹھ کیا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب انہوں نے 'زمیندار' نکالا اور تحریک خلافت کے دنوں میں جب وہ استنبول سے بمبئی پہنچے اور پھر لاہور کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا الطاف حسین حالی نے انہیں اپنی ایک نظم سنانے کے لیے پانی پت آنے کی دعوت دی اور بعد میں جب مولانا ظفر علی خان پروگرام کے مطابق دہلی سے براستہ بٹھنڈہ لاہور پہنچ گئے تو مولانا حالی نے یہ نظم انہیں لاہور بھیجی جو زمیندار میں اور پھر بعد میں مولانا ظفر علی خان کے مجموعہ کلام 'بہارستان' میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار میں یہاں پیش کیے دیتا ہوں:

اے مالک دفتر زمیندار..... اے نازش قوم و فخر اقراں

اے روح رواں جمع احباب ..... اے چشم و چراغ بزم اخواں

اے دیں کے امتحاں میں جانباز ..... اے نصرت حق میں تیغ عریاں

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر..... اے شیر دل اے ظفر علی خاں

ڈالا یہ تیری پکار نے غل..... جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں

جو دل غم قوم سے تھے بے حس..... چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں

پنجاب کو تجھ پہ ہوا اگر فخر..... ہے اس کو یہ فخر ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت..... ہوں زندہ دل جس میں ایسے انساں

مولانا ظفر علی خان اگر ''زمیندار'' ضبط ہوتا تو ''ستارہ صبح'' نکال لیتے تھے، اس طرح سے انگریز حکومت کے خلاف ان کا یہ صحافتی اور قلمی جہاد بدستور جاری رہا۔ ایک دور ایسا بھی آیا جب انہیں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر کے دور میں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ ظفر علی خان ایک حاضر طبع اور موزوں طبع شاعر تھے، ان کا عالم یہ تھا کہ ''مردم دیدہ'' کتاب میں چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ ادھر حقے کی ''نے'' ان کے منہ میں آتی اور اِدھر ان کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت ان کے انگوٹھے کا طواف کرتی، وہ حقے کا ایک کش لیتے، دھواں فضا میں پھیلتا اور کھٹ سے ایک شعر نمودار ہو جاتا۔ اب جب وہ کرم آباد میں نظر بند ہوئے تو انہوں نے وہاں ایک نظم کہی:

کرم آباد کو سر مائیکل نے بنایا ہے میری علمی حوالات

اگر اس وقت میں آزاد ہوتا تو دکھا سکتا نہ شاید یہ کمالات

نہ ہوتی ترجمے کی مجھ کو فرصت، کتابوں میں نہ کٹتے میرے دن رات

نہ ہوتا نعت ہی کا سر میں سودا، دل سے ہی نہ نکل

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سکتی مناجات
پروسکتا نہ موتی روز ایسے، چمک سے ہیں جن
کے شمس وقمرمات
گنواتا شاید اپنے وقت کو، دلاتی شرم مجھ کر میری
اوقات

اسی طرح کرم آباد ہی سے ''ستارۂ صبح'' اخبار نکلتا رہا اور پھر لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یوں مولانا نے پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی جو شہرت کی بلند ترین چوٹی تھی اس کو سر کرلیا، یہ ایک بہت بڑا کام تھا کہ ان کا سر کبھی خم نہ ہوا اور نہ ان کا قلم جھکا۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی مجیب الرحمٰن شامی نے اپنا سر خم نہیں کیا اور ان کی جبین نیاز کبھی بھٹو صاحب کی سول آمریت کے سامنے خم ہوئی اور نہ انہوں نے گردن نیاز کو جھکایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شجاعت، جرات، بہادری، تہور، شیر دلی، عالی حوصلگی، عالی ظرفی، مردانگی، استقامت، استقلال، بسالت، اولوالعزمی، کہسار مزاجی اور انتہائی شہامت کا ایک شاندار، آن دار اور جاندار مظاہرہ تھا جو مجیب الرحمٰن شامی نے اُس ''عصرِ جبر'' میں کیا۔

رانا چیمبرز میں زمانہ طالب علمی میں اور عہد شباب میں ہماری آمد و رفت ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہی۔ میں جب بھی وہاں جاتا تو مجیب الرحمٰن شامی صاحب کو بھی ملتا۔ میں نے وقت کے بڑے بڑے صحافیوں، ادیبوں اور نامور شاعروں کو یہاں دیکھا۔ ان میں ایک بڑا نام جناب ضیاء الاسلام انصاری تھا جنہیں میں نے یہاں دیکھا۔ انصاری صاحب اس زمانے میں روزنامہ مشرق کے ایڈیٹر تھے۔ اسی طرح بہت ہی معروف اور ممتاز صحافی جناب رفیق ڈوگر سے میری وہیں ملاقات ہوئی۔ حبیب جالب بھی آیا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک میں خورشید محمود قصوری ایئر مارشل اصغر خان، جاوید ہاشمی و دیگر حضرات وہاں آیا کرتے تھے۔ سیدھی بات ہے کہ میں تو صرف جناب شامی کو ان کے جرات مندانہ اداریوں کی وجہ سے سلام کرنے جایا کرتا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہیں گل ہائے تحسین پیش کرتا۔

مارچ 1977ء کے الیکشن

خیر بات ہو رہی تھی جاوید ہاشمی کی، تو وہ لاہور سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے۔ وہ راج گڑھ میں میرے گھر تشریف لائے اور انہوں نے مجھے خود کہا کہ میری الیکشن کمپین کو آپ ہی نے سنبھالنا ہے اور آپ ہی اس کے انچارج ہوں گے۔ لہذا رانا چیمبر میں دو دکانوں کو انتخابی آفس بنا دیا گیا جہاں سے ہم نے الیکشن مہم کا آغاز کیا۔ جوان خون تھا اور ہمارے جذبے جوان تھے تو ہم نے اس الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جب 1977ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہو گئے تو قومی اتحاد نے انہیں دھاندلی زدہ قرار دے کر ان کے خلاف ایک تحریک کا اعلان کر دیا اور پوری طرح منظم انداز میں میڈیا (جو کہ ان دنوں صرف چند اخبارات پر ہی مشتمل تھا) کے ذریعے رائے عامہ ہموار کی۔ مسلم لیگ ہاؤس ڈیوس روڈ میں قومی اتحاد کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں نو اتحادی جماعتوں نے شرکت کی اور تمام لیڈروں نے اس پر اتفاق کیا اور ہاتھوں میں قرآن اٹھا کر یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے مقاصد کے حصول اور بھٹو کی سول آمریت کے خاتمے کے لیے ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ ان قائدین میں جمعیت علمائے پاکستان کے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مولانا شاہ احمد نورانی، جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد، پیر پگاڑا، خان عبدالولی خان، ملتی محمود، ایئر مارشل اصغر خان، پی ڈی پی کے نوابزادہ نصراللہ خان اور تحریک خاکسار کے امیر حبیب اللہ سعدی وغیرہ شامل تھے۔ قومی اتحاد نے اعلامیہ جاری کیا کہ وہ ہر نشست پر کامیابی کے جھنڈے گاڑھ چکا تھا لیکن مظلوم دھاندلی کر کے اس کو اپوزیشن میں رکھا گیا۔ بھٹو کے خلاف قومی اتحاد کی اس تحریک نے خوب زور پکڑا اور ہم نے بھی اس میں خوب حصہ لیا۔

اس سلسلے میں لاہور میں 14 مارچ کو ایک بڑا جلوس ایئر مارشل اصغر خان کی قیادت میں نکلنا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ 13 مارچ کی شام مجھے جاوید ہاشمی نے بتایا کہ کل ایک جلوس نکلنا ہے اور ہم نے اس سلسلے میں ایک اہم مشاورتی اجلاس میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کی کوٹھی جو کہ فین روڈ پر واقع تھی، میں طلب کیا ہے۔ میں بھی جاوید ہاشمی کے ساتھ اس کوٹھی پر پہنچا۔

یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میاں محمود علی قصوری اپنے وقت کے ایک بلند قامت اور مایہ ناز قانون دان تھے۔ قصوری صاحب کی کوٹھی پر یہ میٹنگ 13 مارچ کو مغرب کے وقت شروع ہوئی اور دس بجے تک جاری رہی۔ اس میٹنگ میں جو لیڈر شریک ہوئے صاف ظاہر ہے کہ اس میں تحریک استقلال کے لوگ زیادہ تھے۔ ایئر مارشل اصغر خان، میاں محمود علی قصوری، خورشید محمود قصوری، جاوید ہاشمی وغیرہ شامل تھے۔ اجلاس کے بعد طے پایا کہ اب ہم نے گلبرگ مین بلیوارڈ میں واقع ''می کانگ'' نامی ہوٹل میں کھانا کھانے جانا ہے۔ ہم ہوٹل میں پہنچے، یہاں مجیب الرحمٰن شامی بھی آ گئے۔

ان کے اخبار میں کام کرنے والے ایک بہت ہی قدر آور صحافی جناب ممتاز اقبال ملک صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ (ممتاز اقبال ملک بعد میں افواج پاکستان کے شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر کے ماہانہ جریدے 'ہلال' کے ایڈیٹر بھی رہے)۔ ملک صاحب مجیب الرحمٰن شامی کے قلمی رفیق کار تھے اور ان کے جرائد و رسائل میں طویل عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔

اصغر خان کا ہلاکو خاں سے مکالمہ

جب ہم می کانگ ہوٹل سے کھانا کھا کر لابی سے باہر نکلے تو ہم نے دیکھا کہ پولیس نے ہوٹل کو چاروں سے طرف گھیر رکھا ہے۔ یہ ایک منظم پولیس محاصرہ تھا۔ اس محاصرہ کی قیادت ایک بڑے معروف پولیس افسر ایس ایس پی اصغر خان نوانی المعروف ہلاکو خان تھے جو بعد میں ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ہلاکو خان کی بڑی شہرت تھی اور وہ پولیس مقابلہ فیم افسر تھے۔

اصغر خان آگے بڑھے اور انہوں نے ایئر مارشل اصغر خان کی کلائی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: ''یو آر انڈر اریسٹ''۔ ایئر مارشل نے وہاں ایک بڑی زبردست بات کی اور کہا ''اصغر خان! تم میرے ہم نام ہو لیکن ایک بات یاد رکھو کہ میں بہ خوبی جانتا ہوں کہ وردی کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور اخلاقیات کے کیا، یہ بات میں تم سے ہزار درجہ بہتر جانتا ہوں۔ میں پاکستان ایئر فورس کا پہلا سربراہ رہا ہوں۔ تم بھلے کسی کے حکم سے بھی گرفتار کرنے آئے ہو لیکن تمہیں میرے ساتھ اس انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ تم میرے ساتھ ایسا رویہ اختیار کر رہے ہو جیسے تم کسی اخلاقی مجرم کو پکڑ رہے ہو، تمہیں ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ مَیں تمہاری اس روش کو سخت ناپسند کرتا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوں، اس لیے فوری طور پر پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اصغر خان نوانی چار قدم پیچھے ہٹے اور کہا کہ ہم تو آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تو ایئر مارشل اصغر خان نے جواب دیا کہ جب تک آپ مجھے گرفتاری کے عدالتی آرڈر نہیں دکھاتے میں بھٹو صاحب کی زبانی کلامی یا ٹیلی فونک آرڈر پر گرفتاری نہیں دوں گا۔ سیاستدانوں کو گرفتار کرنے کا بھی ایک طریقہ کار، ایک ضابطہ اور قاعدہ ہوتا ہے۔ آپ اس ضابطے کو پامال کرتے ہوئے مجھے پکڑنا چاہیں گے تو میں یہ گرفتاری نہیں دوں گا''۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جب بیسیوں پولیس والوں نے گھیرا ڈال رکھا ہو اور پولیس کو وزیراعظم کی بھی پشت پناہی اور آشیر باد حاصل ہو تو پانچ سات لوگ پولیس بہادر کی مزاحمت کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ بھٹو صاحب کی یہ شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ایئر مارشل اصغر خان پر ہاتھ ڈالا جائے۔ ان دنوں بھٹو صاحب کا ایک ڈائیلاگ ''فکس اپ'' مشہور ہوا تھا۔ وہ اپنے ہر مخالف کو کہتے تھے کہ میں اسے ''فکس اپ'' کروا دوں گا۔

جاوید ہاشمی جلال میں آ گئے

جب گفتگو آگے بڑھی تو جاوید ہاشمی نے بھی اصغر خان المعروف ہلاکو خان کو کہا کہ 'تم ناشائستہ حرکت کر رہے ہو اور پیچھے ہٹ جاؤ' تو ہلاکو خان نے کہا کہ زیادہ باتیں مت کرو اور گرفتاری دو تو اس پر جاوید ہاشمی جلال میں آ گئے۔ میں اس وقت ان کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ پیرسائیں کی ایک یہ خاص پہچان تھی کہ بھٹو دور میں انتظامیہ کو دیکھتے ہی ان کا پارہ خطرے کی ریڈ لائن کو چھونے لگتا اور وہ ناقابل تسخیر ''جلال'' میں آ جاتے۔ بھلے سامنے پولیس افسر ہوتا، کمشنر ہوتا یا مجسٹریٹ، جاوید ہاشمی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اپنا نعرۂ رست خیز بلند کر دیتے۔ یہاں بھی جب انہوں نے اپنا نعرہ رستخیز بلند کیا۔ جہاں دو اڑھائی سو کے قریب پولیس اہلکار موجود ہوں تو چھ یا سات سیاسی ورکرز کیا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اصغر خان نوانی المعروف ہلاکو خان نے فوراً حکم دیا کہ ان سب کو اٹھا کر پولیس کے ٹرک میں پھینک دو۔ لہٰذا ہم سب کو گرفتار کر کے ایک پرانے سے پولیس ٹرک میں ٹھونس دیا گیا۔ ٹرک میں میں تھا اور میرے ساتھ جناب جاوید ہاشمی، ایئر مارشل اصغر خان، ممتاز اقبال ملک، خورشید محمود قصوری، اسحاق ظفر ایڈووکیٹ اور مجیب الرحمٰن شامی تھے۔

رات گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب ہم گرفتار کیے گئے۔ آج تو بہترین سڑکیں بن گئی ہیں جبکہ اس وقت می کانگ ہوٹل گلبرگ سے چوہنگ پولیس سنٹر تک زیادہ سے زیادہ سفر ایک گھنٹے کا ہوگا لیکن ہمیں وہاں پہنچنے میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ ہمیں لاہور کی مختلف سڑکوں پر گھمایا جاتا رہا۔ شاید پولیس والے اس انتظار میں تھے کہ کوئی نیا آرڈر آئے اور ہم ان کو ادھر ہی کہیں ڈراپ کر دیں لیکن ایسا کوئی حکم نامہ نہ آیا اور آخر کار پولیس ہمیں تھانہ چوہنگ لے آئی۔ وہاں اس وقت جو ایس ایچ او تھے ان کا نام امان اللہ خان تھا۔ یہ بعد میں نواز شریف کے دور میں ایس پی لاہور پر موٹ ہوئے۔ جب ہم تھانہ چوہنگ میں پہنچے تو وہاں اس وقت امان اللہ خان ایس ایچ او موجود نہ تھے اور عملے نے ہمیں ریسیو کر کے حوالات میں بند کرنا چاہا تو اسی وقت امان اللہ خان آ گئے، ہمیں دیکھا اور پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں جب معلوم ہوا کہ ایئر مارشل اصغر خان، جاوید ہاشمی اور ان کے دیگر ساتھی آئے ہیں اور یہ لوگ اس وقت

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بھٹو مخالف تحریک چلا رہے ہیں تو اس نے ہمیں حوالات میں بند نہ کیا۔

ایس ایچ او امان اللہ کی مہمان نوازی

کچھ ہی دیر بعد حکام بالا کے حکم پر ایئر مارشل اصغر خان، مجیب الرحمٰن شامی، ممتاز اقبال ملک، خورشید محمود قصوری و دیگر کو تھانہ مناواں میں منتقل کر دیا گیا۔ میں اور جاوید ہاشمی ادھر ہی رہ گئے۔ یہاں میں یہ بھی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میں اس وقت کوئی اتنا قابل ذکر شخص نہ تھا، بس بڑے لوگوں کے ساتھ اجلاس میں شریک ہونے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میری اور جاوید ہاشمی کی تھانہ چوہنگ کے ایس ایچ او امان اللہ خان نے اس قدر تواضع کی کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے اپنے گھر سے چارپائیاں منگوائیں، نئے بستر منگوائے، یہ مارچ کا مہینہ تھا اور رات کو بسا اوقات موسم خنک ہو جاتا تھا اور کسی بھی وقت یہ امکان باقی رہتا تھا کہ شاید رات مزید خنک ہو جائے تو حفظ ماتقدم کے طور پر ہماری چارپائیوں کی پائنتی کی طرف کھیس بھی رکھ دیئے گئے۔ یہ کھیس والی بات بظاہر تو معمولی ہے لیکن پنجاب پولیس کی جو روایت ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ ایک بہت بڑی خدمت تھی اور خاص طور پر ایک حوالاتی کو ایسا پروٹوکول ہرگز نہیں دیا جاتا۔ ہم سو گئے اور جب اٹھے تو نماز فجر کے بعد امان اللہ خان نے ہم سے ناشتے کا پوچھا کہ آپ کیا پسند کریں گے؟ امان اللہ خان جس قدر اچھا اور معیاری ناشتہ ہمیں فراہم کر سکتے تھے انہوں نے کیا۔ ایک دن پورا ہم ان کی تحویل میں رہے لیکن انہوں نے ایک لمحہ بھی ہمیں حوالات نہیں دکھائی۔

ہم ان کی مہمان نوازی پر بہت زیادہ حیران تھے کیونکہ ان کا رویہ اور برتاؤ ہرگز پنجاب پولیس جیسا نہ تھا۔ خیر ہمارا یہ تجسس زیادہ دیر نہ رہا اور ہمیں معلوم ہوا کہ جو بھی بھٹو مخالف سیاسی قیدی امان اللہ خان کی تحویل میں دیا جاتا ہے وہ اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ بعد میں امان اللہ خان نے ہمیں خود بتایا کہ وہ آخر بھٹو صاحب کا اس حد تک مخالف کیوں ہے اور اینٹی بھٹو ز کی خدمت کیوں کرتا ہے؟ امان اللہ خان نے بتایا کہ اس مخالفت کا پس منظر یہ ہے کہ 1971ء کے الیکشن میں بھٹو صاحب جیت گئے تو میں اس وقت لاہور کے کینٹ ایریا میں تعینات تھا، اس علاقہ میں ایک ڈاکو تھا جو علاقہ بھر میں وارداتیں کرتا تھا اور خوف و دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ نیم برہنہ حالت میں وارداتیں کرتا، اپنے پورے جسم پر کڑوا تیل لگا لیتا تھا اور اس قدر چکناہٹ میں رچ بس جاتا تھا کہ اسے جو بھی پکڑنے کی کوشش کرتا وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نکل جاتا۔ اس کی رنگت بالکل سیاہ تھی، وہ اس قدر کالا بھجنگ تھا کہ اسے ''کالا ڈاکو'' کے نام سے ہی پکارا جاتا تھا۔ کینٹ اور دیگر مضافاتی علاقوں کی آبادیاں اس ڈاکو سے بہت تنگ تھیں کیونکہ وہ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر وارداتیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے اس کی واردات کی اطلاع ملی تو میں موقع واردات پر جا پہنچا اور اس نے ہم پر فائرنگ شروع کر دی اور جب ہم نے ردعمل کے طور پر اس پر فائر کیا تو وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ جب اس کی ہلاکت کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس سے اگلے روز ہی ذوالفقار علی بھٹو اس کے گھر پر تعزیت کے لیے پہنچ گئے اور جب انہیں میرے متعلق بتایا گیا تو انہوں نے میری فوری گرفتاری کا حکم دے دیا۔ یوں میں نے اس کیس کا سامنا کیا اور

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

جیل کاٹی۔ بجائے اس کے کہ بھٹو صاحب قانون کا نفاذ کرنے والے افسر کا ساتھ دیتے انہوں نے ایک سکہ بند جرائم پیشہ شخص کا ساتھ دے کر مجھے گرفتار کروا دیا۔ بس اب اس کے بعد سے میں بھٹو صاحب کا شدید مخالف ہوں۔ سیدھی بات ہے کہ بھٹو کے خلاف جو اس وقت قومی اتحاد کام کر رہا ہے اس میں شامل تمام کارکنوں کو مَیں مجاہد تصور کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ظلم کے خلاف اور اصل جمہوریت کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی میں اس انداز سے مدد کرتا ہوں کہ جو بھی میرے پاس بھٹو مخالف لوگ گرفتار کر کے لائے جاتے ہیں میں ان کو تعظیم و تکریم دیتا ہوں اور ان کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھتا ہوں، جیسا کہ میں نے آپ کے ساتھ کیا۔ پھر یوں ہوا کہ اس سے اگلے دن یعنی 16 مارچ 1977ء کو امان اللہ خان نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے کہا مجھے تازہ حکم ملا ہے کہ آپ کو تھانہ چوہنگ سے کہیں اور منتقل کر دوں۔ جاوید ہاشمی نے ان سے ''نئی منزل'' کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میری طرف سے معذرت سمجھیں کیونکہ مجھے منع کر دیا گیا ہے اور میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ بہر حال اب میری مہمان داری ختم ہے اور میں بہت مجبور ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ لہٰذا اب آپ گاڑی میں تشریف لے جائیں اور میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں جس جگہ کی نشاندہی حکام بالا نے کی ہے۔

شاہی قلعہ کا عقوبت خانہ

اس کے بعد میری اور جاوید ہاشمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور کوئی چالیس منٹ تک گاڑی چلتی رہی اور جب ہمیں گاڑی سے اتار کر آنکھیں کھول دی گئیں تو میں چونکہ پیدائشی اندرون لاہور کا رہنے والا ہوں تو مجھے یہ جاننے میں بالکل دشواری نہ لگی کہ ہم شاہی قلعہ میں آ گئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو میں اس موقع پر نہ تو جھوٹ بول کر کسی ٹارزن کا کردار ادا کرنا چاہوں گا اور نہ ہی رستم، سہراب، اسفندیار یا افراسیاب بننا چاہوں گا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں پر ہیبت شاہی قلعہ دیکھ کر کانپ گیا تھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اس وقت میری عمر یہی 21 یا 22 سال ہوگی تو صاف بات یہی ہے کہ میں بہت ڈر گیا تھا اور اس ڈر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کچھ ہی دن قبل آغا شورش کاشمیری کی کتاب ''پس دیوار زنداں'' پڑھ رہا تھا اور اس میں مَیں وہ حصہ پڑھ چکا تھا اور وہ اقتباسات ازبر کر چکا تھا جن میں شاہی قلعہ میں قیدیوں پر روا رکھے جانے والی صعوبتوں اور اذیتوں کا ذکر تھا۔

سیدھی بات ہے یہ دیکھ کر میں تو گھبرا گیا لیکن اس وقت مجھے جاوید ہاشمی نے بہت حوصلہ دیا۔ جاوید ہاشمی کو میں نے ہر دور اور ہر حالت میں بڑا ثابت قدم دیکھا ہے۔ جاوید ہاشمی نے میرا مورال بلند کرنے کے لیے کہا ''یار سنو، یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے کبھی آپ نے بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ کی سیر کی ہے؟''...... میں نے جواب دیا ''بالکل بھی نہیں''۔ انہوں نے کہا کہ ''دیکھو بھئی جب بھی بیرون ملک سے کوئی بڑی اہم شخصیت آتی ہے تو صرف وہ بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ کی سیر کرتی ہے اور یا پھر ہم جیسے سیاسی لوگ جو شہری آزادیوں کی جنگیں لڑتے ہیں بغیر ٹکٹ یہاں آ سکتے ہیں، اب ہم بغیر ٹکٹ کے شاہی قلعہ دیکھنے جا رہے ہیں اور تم پریشان ہو رہے ہو''۔ اس پر میرا حوصلہ بہت بلند ہوا اور میں ہنس پڑا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

جاوید ہاشمی نے مزید کہا'' حافظ صاحب گھبرانا بالکل بھی نہیں، ہمیں یہ وقت نہایت صبر اور استقامت سے گزارنا ہے''۔

ہم 16 مارچ 1977ء سے لے کر 22 مارچ کی درمیانی شب تک شاہی قلعہ میں محبوس رہے۔ ہم ایک بالکل چھوٹے اور تاریک تہ خانے میں قید تھے، اب اس کمرے کا سائز میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ 8x6 کا تھا یا 8x4 کا تھا۔ بار بار پولیس اہلکار آتے اور سلاخوں پر لاٹھیاں برساتے تاکہ ہم سو نہ سکیں اور ہم واقعی سو نہیں سکتے تھے۔ یہ سیلن زدہ کوٹھڑی تھی اور اس میں تعفن بہت زیادہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا امتیاز یہاں پر ختم تھا۔ مجھے بالکل اچھی طرح یاد ہے کہ یہ 22 اور 23 مارچ 77ء کی درمیانی شب تھی جب ہمیں ایک اہلکار نے باہر نکالا۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ ہمیں مزید ٹارچر کرنے کے لیے کہیں لے جا رہے ہیں کیونکہ اس سے قبل بھی وہ ہمیں الگ الگ باہر لے آئے تھے اور پھر مجھے ایک الگ بڑے سے کمرے میں لے گئے جس میں ہر طرف '' آلاتِ تعذیب'' یعنی تشدد کرنے کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں ہم نے حنیف رامے کو بھٹو صاحب کے حکم پر گرفتار کر کے رکھا تھا اور پھر ہم نے ان کے لباس کی تقدیس کو بھی بالکل پامال کر دیا تھا۔ یہ سن کر میں کانپ کر رہ گیا کہ کیا اس حد تک شرمناک تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح پیپلز پارٹی ہی کے ایک بڑے سیاستدان ہوا کرتے تھے جن کا مکمل نام حافظے سے اتر رہا ہے انہیں خاکوانی صاحب کہا جاتا تھا۔ اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ اسی کمرے میں خاکوانی پر بھی بے انتہا تشدد کیا گیا تھا۔ نہایت افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ پولیس والے اس '' تشدد'' کو کسی اور اندازِ تشدد سے وابستہ کر کے بتا رہے تھے جبکہ میں یہاں ملفوف پیرائے میں بات کر رہا ہوں۔ پولیس والے تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے جسے من وعن بیان کرنے کا مجھے ہرگز حوصلہ نہیں۔ بھٹو صاحب کے دور میں جب جماعت اسلامی کے مرکزی راہنما میاں طفیل محمد صاحب کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ لایا گیا تھا تو ان پر بھی اسی طرح غضب ناک اور بلکہ شرمناک انداز سے تشدد کیا گیا تھا۔ اتنے بڑے عالم دین، جید، پارسا، صالح اور متقی راہنما کے ساتھ میرے خیال سے اس قدر شرمناک سلوک کی مثال نہیں ملتی۔

بہرحال اہلکار مجھے یہ کمرہ دکھا رہے تھے تو ماضی کا ایک کرب ناک سانحہ بھی میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کمرے میں دیوار کے اندر ایک لوہے کا بہت بڑا میخ نما کیل بڑی مضبوطی سے پیوست کیا گیا تھا۔ اس کیل کے نیچے ایک چوکی یا سیڑھی نما چیز رکھی تھی، مجھے اہلکاروں نے جب اس پیڑھی پر کھڑا کیا تو میری گردن اس نوکیلے لوہے کے سریے کے بالکل سامنے آ گئی تو انہوں نے مجھے اس موقع پر ایک بڑی ہی کرب ناک داستان سناتے ہوئے کہا کہ جنرل ایوب خان کے دور میں ممتاز ترقی پسند طالب علم راہنما حسن ناصر کو جب یہاں کھڑا کر کے پیچھے سے پوری قوت سے دھکا دیا گیا تھا تو یہ لوہے کی سلاخ ان کی گردن کے آر پار ہو گئی تھی اور وہ کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئے تھے۔ اب جب مجھے اور جاوید ہاشمی کو ایک بار پھر رات کے وقت باہر نکالا گیا تو یہ ساری کیسٹ میرے دل و دماغ میں ریوائنڈ ہو گئی کہ شاید یہ ہم پر بھی کچھ ایسا ہی تشدد

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرنے لگے ہیں۔ لیکن اب وہ ہمیں باہر نکال کر سیدھا ایس پی فورٹ کے پاس لے گئے جنہیں درانی صاحب کہا جاتا تھا، ان کا پورا نام تو میرے حافظے سے محو ہو گیا ہے البتہ اتنا یاد ہے کہ وہ بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ جب ہمیں درانی صاحب کے کمرے میں لایا گیا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاس اپنے وقت کے بہت بڑے وکیل ایم انور بارایٹ لاء موجود تھے۔ انور صاحب ہائی کورٹ سے ہماری دستیابی کا حکم نامہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جو ایک ہفتہ سے شاہی قلعہ میں قید تھے تو ہمیں رہائی دلوانے کے لیے انور صاحب نے لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کر رکھا تھا اور اب پولیس ہمیں شاہی قلعہ سے لنڈا بازار کی نکڑ پر واقع لاہور کے تاریخی تھانہ کوتوالی میں لے آئی۔

جاوید ہاشمی کا ہلا گلا

چند گھنٹے ہم نے یہاں گزارے۔ اس دوران ایم انور بارایٹ لاء ہمارے ساتھ رہے اور ہمیں حوالات میں بند نہیں کیا گیا۔ کچھ دیر بعد راشد بٹ نامی ایک سب انسپکٹر ہمیں لے کر ضلع کچہری آ گیا، یہ 23 مارچ 1977ء اور اتوار کا دن تھا۔ جب ہم عدالت پہنچے تو اتوار کو صرف ایک ہی سٹی مجسٹریٹ عدالت لگاتا تھا۔ پولیس والوں نے ہمیں جیپ میں ہی بٹھائے رکھا۔ صرف سب انسپکٹر اندر گیا اور کچھ ہی دیر بعد واپس آ کر یہ مژدہ سنایا کہ مجسٹریٹ نے آپ کو جوڈیشل ریمانڈ پر کیمپ جیل میں بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ جاوید ہاشمی نے اس موقع پر خوب احتجاج کیا کہ جب ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا تو اس نے کیسے یہ حکم نامہ جاری کر دیا ہے۔ یہ تو بالکل خلاف قانون ہے۔ بہرحال جاوید ہاشمی نے وہاں پر کافی "ہلہ گلہ" کیا اور یہ شور سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو پولیس کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ جاوید ہاشمی کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی صورت پولیس کی گاڑی سے باہر آ جائیں اور سیدھا سٹی مجسٹریٹ کے سامنے جا کر اس سے پوچھیں کہ کیا یہ قانون آپ کے گھر کی لونڈی ہے کہ جس طرح چاہے استعمال کرو۔ خیر ایسے موقع پر پولیس حراست میں موجود آدمی کی کون سنتا ہے اور پھر ریاستی اداروں کے آگے کس کی چلتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید پولیس اہلکار بھی آ گئے۔ انہوں نے راستہ بنایا لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور ہم سیدھا کیمپ جیل لاہور پہنچا دیئے گئے۔ کیمپ جیل میں ہم مزید چالیس دن رہے اور 20 اپریل 1977ء کو ہماری رہائی عمل میں آئی۔ ہم پر مختلف الزامات کے تحت مقدمات بنائے گئے تھے جو کہ عموماً سیاسی لوگوں پر بنائے جاتے ہیں یعنی 16 ایم پی او، تخریب کاری اور پتا نہیں کون کون سی دفعات لگائی گئی تھیں۔ پھر ہماری درخواست لاہور ہائی کورٹ میں لگی اور ہمیں چالیس دن بعد رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے اگلے دن یعنی 21 اپریل 1977ء کو قومی اتحاد نے ملک گیر پہیہ جام ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔ اس موقع پر لاہور شہر کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر ایک ہی گونج دار صدا سنائی دیتی تھی کہ: "کل کیا ہوگا۔ پہیہ جام" ۔یہ بڑی دہشت ناک اور ہیبت ناک صدا تھی۔ اس ہڑتال میں بھرپور انداز میں عوامی طاقت کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور یہ ہڑتال بڑی کامیاب رہی۔

یہاں میں بتاتا چلوں کہ 1977ء کی قومی اتحاد تحریک میں میری گرفتاری پہلی مرتبہ نہیں تھی بلکہ میں اس سے قبل بھی تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران 1974ء میں گرفتار ہوا تھا اور کم و بیش اتنے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ہی دن کوٹ لکھپت جیل میں رہا تھا۔تحریک ختم نبوت میں جیل کے جو میرے ساتھی تھے ان میں لیاقت بلوچ، ڈاکٹر منصور الحمید، فرید پراچہ، نعیم سرویا، اکمل جاوید اور اسلامی جمعیت طلبہ لاہور کے لوگ شامل تھے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے سیل میں جو دوسرے ساتھی میرے ساتھ قید تھے ان میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے اس وقت کے ناظم اعلیٰ اور نہایت مقبول شخصیت ظفر جمال بلوچ تھے۔یہ حسن اتفاق تھا کہ ہم ایک ہی کمرے میں آ گئے تھے۔اسی طرح جمعیت کے نعیم سرویا ہمارے ساتھ تھے۔تحریک ختم نبوت میں حصہ لینے کی پاداش میں ہم نے ایک ماہ کے Detention آرڈرز کے تحت جیل کاٹی تھی۔

یہاں ہمارے ساتھ والی بیرک میں وہ فوجی قید تھے جن پر الزام تھا کہ انہوں نے 1972ء یا شاید 1973ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی میلے میں شرکت کے موقع پر انہیں قتل کر کے فوجی بغاوت کا پروگرام بنایا تھا۔جن لوگوں کے نام مجھے اب تک یاد ہیں ان میں ایک کیپٹن سرور تھے اور دوسرے میجر ایاز علی سپرا تھے۔کیپٹن سرور لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر کے صاحبزادے تھے اور میجر ایاز علی سپرا آئی جی پولیس بلوچستان نیاز علی سپرا کے کوئی قریبی عزیز تھے یا پھر شاید ان کے بھائی تھے۔اس سارے مبینہ حملے کا ماسٹر مائنڈ ایئر مارشل اصغر خان کے ایک قریبی عزیز کو قرار دیا جاتا تھا۔

اب ان فوجی قیدیوں اور ہمارے مابین ''بر سبیل تفنن'' ایک اچھی خاصی ''چونچ بازی'' ہوا کرتی تھی۔فرید پراچہ ان کو کہا کرتے تھے: ''بڑے آئے تھے قائد عوام، فخر ایشیا، وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان کو راستے سے ہٹا کر فوجی انقلاب برپا کرنے اور اب پڑے ہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے''۔فرید پراچہ کے اس ''مصرع طرح'' پر کیپٹن سرور یہ گرہ لگاتا کہ ''بڑے آئے تھے اسلامی انقلاب برپا کرنے اور اب بے چارے جیل کی اونچی دیواروں کے پیچھے تنگ کوٹھڑیوں میں محبوس ہیں''۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں اور ظفر جمال بلوچ جیل میں روم میٹ تھے۔خیر روم میٹ کی اصطلاح تو عام طور پر ہاسٹل کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے ''جیل برڈ'' کہہ لیں تو بہتر ہے۔یعنی میں اور ظفر جمال بلوچ ''ہم قفس'' تھے۔میں نے اپنی پوری زندگی میں ظفر جمال بلوچ جیسا صالح، دینی مزاج رکھنے والا اور دینی اقدار و روایات اور شعائر میں گندھا ہوا شخص نہیں دیکھا۔

تحریک ختم نبوت میں شمولیت

تحریک ختم نبوت کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو ختم نبوت کے مفہوم اور قادیانیت کی ریشہ دوانیوں کے متعلق آگاہ کیا جائے۔جن مقررین کو لاہور میں اس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا ان میں حافظ سلمان بٹ، لیاقت بلوچ، ظفر جمال بلوچ اور دیگر حضرات شامل تھے۔ان مقررین کی فہرست میں مَیں اس لیے بھی شامل تھا کہ میں ان دنوں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کی طلبہ یونین کا منتخب نائب صدر تھا۔لہٰذا جہاں بھی جلسہ ہوتا مجھے اطلاع دے دی جاتی اور میں وہاں پہنچ جاتا اور اس وقت قادیانیت کے متعلق میرا جو بھی حاصل مطالعہ تھا وہ سارا سامعین کے سامنے پیش کرتا۔اس زمانے میں مَیں نے آغا شورش کاشمیری کا تازہ تازہ کتابچہ پڑھا تھا جس کا نام تھا ''عجمی اسرائیل''۔اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ قادیانی اسلام اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں کس

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

طرح سے مصروف عمل ہیں اور سر ظفر اللہ خان جو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ تھا اس کا کس قدر منفی کردار تھا۔ جب قائداعظم محمد علی جناح کی نماز جنازہ کے موقع پر ظفر اللہ خان غیر مسلم ممالک کے چند سفیروں کے ساتھ باہر بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا تو کسی نے اس سے کہا کہ ”آپ قائداعظم کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے کیوں نہیں جا رہے؟“..... تو اس نے قہقہہ لگا کر یہ جواب دیا کہ ”یا تو آپ اس تابوت میں پڑے شخص کو کافر سمجھ لیں یا پھر مجھے کافر سمجھ لیں“۔ گویا میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ظفر اللہ خان بطور وزیر خارجہ وہ پہلا قادیانی تھا جس نے تسلیم کیا تھا کہ قادیانی غیر مسلم ہیں۔

اب 1974ء میں قومی اسمبلی میں جو قراردادیں پیش کی جا رہی تھیں اور جو کارروائی ہو رہی تھی اس میں یہی مطالبہ سرفہرست تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ اس موقع پر مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق تمام ریفرنسز قومی اسمبلی میں مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی اور یحییٰ بختیار نے پیش کیے۔ یحییٰ بختیار اٹارنی جنرل آف پاکستان تھے۔ انہوں نے جس انداز سے قادیانیوں اور لاہوری قادیانیوں پر جرح کی اور ان کو ناکوں چنے چبوائے، تاریخ کبھی ان کا کردار نظر انداز نہیں کر سکتی۔ قادیانی ان کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر رہے اور یہ بہت بڑا کریڈٹ ہے جو جناب یحییٰ بختیار کو جاتا ہے۔ اس میں باقی علماء بھی تھے، ان کا کردار بھی تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پوری قومی اسمبلی ایک پیج پر تھی۔ پی پی پی، مسلم لیگ، اے این پی، جے یو آئی، جے یو پی، غرض یہ تمام لوگ ایک ہی صف میں تھے اور یوں ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے سے مورخہ 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ جب قادیانی غیر مسلم قرار پا گئے تو اس دن پورے ملک میں جشن کا سماں تھا اور پھر ہم لوگوں کی تو خوشی دیدنی تھی کہ جنہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ تحریک ختم نبوت میں میری گرفتاری مئی 1974ء میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب تحریک ختم نبوت پورے عروج پر تھی اور شہر شہر اور گاؤں گاؤں ایک لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس دوران نامور خطباء اور مقررین کو سننے کا نہ صرف موقع ملا بلکہ میں نے ان مشاہیر کی موجودگی میں تقریریں بھی کیں۔ ان میں مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا مسلم بخش بی اے، مولانا عبد القادر روپڑی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا منظور چنیوٹی، مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا محمد اجمل خان، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا مفتی محمود، مولانا تاج محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، علامہ محمود رضوی، خطیب آل محمد سید اظہر حسن زیدی، سید مظفر علی شمسی سمیت دیگر بہت سے اور ہر مسلک و مشرب کے بلند پایہ خطیبوں کو سنا اور ان کے سامنے تقریریں بھی کیں۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے وقت کے ان مشاہیر کی ”خرد نوازی“ ہی تھی کہ ان میں سے جو بھی تقریر کرنے کے لیے مائیک پر آتا تو میں چونکہ ایک طالب علم ہونے کے ناتے ان سے پہلے تقریر کر چکا ہوتا تو میرے بعد آنے والے مقررین میری تقریر کی تحسین کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے والدین اور میرے عظیم اساتذہ کی جوتیاں سیدھے کرنے کا صدقہ اور ثمرہ تھا۔

تحریک ختم نبوت میں مَیں دو بار گرفتار ہوا۔ شاید انتظامیہ سمجھتی تھی کہ یہ بچے ہیں، طالب علم ہیں اور انہیں گرفتار کریں گے تو شاید یہ سدھر جائیں لیکن ہمارے دل و دماغ میں جو ختم نبوت کے تحفظ کا ایک

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ناواقف رہا تھا وہ تحریک گویا ہو کر رکھ دیا اور بالآخر 7 ستمبر 1974ء کو قادیانیوں کو آئینی طور پر کافر اقلیت قرار دے دیا گیا۔

تحریک ختم نبوت کے دوران میری پہلی گرفتاری میرے گھر سے گلی میں لائی گئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کھڑی تھی اور گلی میں میرے والد صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر گھر کی طرف آ رہے تھے۔ اس موقع پر محلے والوں نے پولیس سے کہا کہ بھئی یہ تو شریف لوگ ہیں آپ انہیں کیوں پکڑتے ہیں تو پولیس والوں نے جواب دیا کہ اوپر سے ڈپٹی کمشنر نے دستخط کر کے آرڈر جاری کیے ہیں اور ہم مجبور ہیں۔ چنانچہ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے چند گھنٹے مزنگ تھانے میں گزارے۔ میں سخت پریشان تھا کہ پتہ نہیں میرے گھر والوں کو معلوم ہے کہ نہیں کہ مجھے کون سے تھانے میں رکھا گیا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ کے لوگ تھانے آنا شروع ہو گئے جو اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لاتے تھے۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے کل چار مرتبہ جیل کاٹی۔ یعنی قومی اتحاد کی تحریک میں، تحریک ختم نبوت کے دوران، تیسری اور چوتھی مرتبہ 1993ء میں نواز شریف کی تحریک نجات کے دوران۔ اس دوران میرا تجربہ یہ رہا ہے کہ جمعیت کا نظم بہترین کا مظاہرہ کرتی تھی۔ جو بھی ان کا کارکن گرفتار ہوتا تو فوری طور پر پتہ چلا لیتے اور پھر متعلقہ تھانے میں کھانا وغیرہ لے کر فوری طور پر پہنچ جاتے۔ اس حوالے سے میں اپنے اسیروں کا جو خیال اس طلبہ تنظیم نے رکھا اس کی مثال اس وقت کی دوسری جماعتوں میں ملنا مشکل ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔

تحریک ختم نبوت میں جب دوسری مرتبہ جیل کاٹی تو اس موقع پر بھی میرے ساتھ جاوید ہاشمی اور احسان اللہ وقاص تھے۔ جیل میں ہم کئی ماہ رہے۔ ہم کو جاوید ہاشمی کی وجہ سے بھی بہت زیادہ لوگ ہم سے ملاقات کے لیے جیل آتے تھے۔

لاہور کے بدمعاش/ ''پہلوان''

جیل میں لاہور کا ایک مشہور بدمعاش ''شاہیا'' بھی قید تھا۔ حویلی بارود خانہ اور رتی گیٹ سینما کے علاقوں میں شاہیا بدمعاش کی اپنی ایک سلطنت اور ریاست تھی۔ وہ لاہور کا ایک بڑا نام تھا اور اس کا بڑا دبدبہ تھا۔ میں نے جیل کی ڈیوڑھی میں دیکھا کہ شاہیا بدمعاش نیچے چوکڑی مار کر بیٹھا ہوا ہے اور ایک بہت بوڑھی خاتون کہ جس کے چہرے پر جھریاں برگد کی چھال کی طرح لگی ہوئی ہیں وہ اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا اور اس کے پاؤں چوم رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ میری ماں ہے۔ اب اس زمانے کی قدریں، روایات اور والدین کا احترام دیکھیں کہ معاشرہ جن کو ان پڑھ، جاہل، غنڈہ اور بدمعاش کہتا ہے وہ بھی والدین کے معاملے میں اس قدر حساس تھے اور والدین کا احترام کرتے تھے۔ اسی جیل میں ہماری ملاقات وسن پورہ شمالی لاہور کے ایک بہت بڑے بدمعاش۔ معذرت، اب میں لفظ بدمعاش استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اب ایسے لوگوں کو ''پہلوان'' کہا جاتا ہے۔ علاقہ وسن پورہ اور شمالی لاہور کا ایک بہت بڑا پہلوان تھا ''بابا بیتاں والا'' اس سے بھی ہماری جیل میں ملاقات ہوئی۔ اب اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور پکا نمازی تھا، ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جیل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں آ کر انسان کو اللہ یاد آ جاتا

ہے۔

جب دِیا رنج بتوں نے تو خدا یادآیا

اسی جیل کے اندر ایک اور بہت بڑے پہلوان حافظ صمد کو بھی ہم نے دیکھا۔ اب ان ''پہلوانوں'' کی بات چل نکلی ہے تو عرض کرتا چلوں کہ اس زمانے میں لاہور میں بستہ الف کے چار معروف بدمعاش یا پہلوان تھے۔ حافظ صمد، اچھا شوکر والا، جگا گجر اور سلیم نمبردار۔ حافظ صمد بہت اچھے انسان تھے، یہ بھی ہمیں جیل میں ملے۔ جب بھی ہم سے ملتے بڑی خوبصورت گفتگو کرتے۔ یہ بڑے ہی نفیس اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے۔ حافظ صمد ہمیں کہتے تھے کہ یار آپ لوگ ختم نبوت کے تحفظ کی خاطر جیل میں آئے ہیں۔ آپ عاشقان رسولؐ ہیں اور میں اس لیے بڑی عقیدت کے ساتھ آپ کو ملنے آتا ہوں۔ اسی طرح قلعہ گجر سنگھ اور ریلوے سٹیشن کے علاقوں میں بھی بستہ الف کا ایک پہلوان رہتا تھا جس کا نام تھا اچھا شوکر والا۔ اچھا شوکر والا نے بہت ہی شہرت پائی۔ یہ لاہور کا ایک نہایت معروف اور دہشت ناک نام تھا۔ میرے استاد محترم آغا شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''موت سے واپسی'' میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسلامیہ پارک سے لے کر مزنگ، مہاجر آباد، سوڈیوال اور دیگر آس پاس کے علاقوں میں جس پہلوان کا سکہ چلتا تھا اس کا نام سلیم نمبردار تھا۔ ان پہلوانوں کا ذکر ریاض بٹالوی نے ان دنوں اپنے ایک فیچر میں بھی کیا تھا۔

اسی طرح لاہور میں بستہ ب کے جو بدمعاش تھے ان میں ایک بھولا چکی والا تھا۔ یہ گوالمنڈی کا رہنے والا تھا اور لاہور کے ایک لارڈ میئر خواجہ ریاض محمود کا خسر تھا۔ بستہ ب کے دوسرے بدمعاش کا نام تھا ملاں مظفر۔ یہ بازار حسن اور اس کے گرد ونواح کے علاقہ کا پہلوان تھا۔ اگر ہم ٹکسالی کی طرف سے آئیں تو ہیرا منڈی کے آغاز ہی میں ایک مسجد ہے جو چھوٹی شاہی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ بہت قدیم مسجد ہے۔ اس مسجد کے جو خطیب (ان کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) تھے ملا مظفر ان کے بیٹے تھے جو بعد میں غلط راستوں پر پڑ گئے تھے۔ امین پارک میں میرے گھر کے قریب کریم پارک میں ان کی رہائش تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان پہلوانوں کی پرورش کون کرتا تھا؟ ان کی ساخت اور پرداخت کون کرتا تھا؟ انہیں معاشرے کے لئے دہشت اور وحشت کی علامت اور استعارہ کون بناتا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے سیاسی عناصر ''پہلوان'' بنایا کرتے ہیں یا پھر پولیس بنایا کرتی ہے۔ پولیس کی سرپرستی کے بغیر کوئی بھی بندہ بدمعاش اور پہلوان نہیں بن سکتا۔ میں یہاں پر یہ پیغام بھی دینا چاہوں گا کہ وہ نوجوان کہ جنہیں یہ پہلوان بہت متاثر کرتے ہیں، اور غنڈہ گردی کے ذریعے نام بنانے والے لوگوں کو وہ ''ہیرو'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے اور ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ایک ترکیب استعمال ہوتی ہے ''شعلۂ مستعجل''۔ یہ جرائم پیشہ لوگ شعلۂ مستعجل ہی ہوتے ہیں۔ یہ پھلجھڑی کی طرح چند لمحوں کی بہار دکھاتے اور پھر اس کے بعد راکھ ہو جاتے ہیں......

اسی طرح میرے ایک شاگرد اور دوست تھے جو بعد میں کونسلر بھی بنے۔ انہوں نے بدمعاشی چھوڑنا بھی چاہی تو نہ چھوڑ سکے اور اس وقت کی برسر اقتدار پارٹی مسلم لیگ نواز نے ان کو دوبارہ جرائم پر مجبور کرنا چاہا۔ اس نوجوان کا نام تھا طاہر پرنس۔ اس کی ہیبت سے سادھی گنگا رام، بلال گنج، امین پارک اور

چودھری پارک کے علاقوں میں جو اصل ''پہلوان'' تھے وہ غائب ہوگئے تھے۔ ان سارے علاقوں میں بجاروں کی پہلوانی کا سکہ چلتا تھا اور ان کے اس نظام کو جس نوجوان نے تلپٹ کیا اس کا نام تھا طاہر پرنس۔ اس کا اصل نام طاہر نفیس اختر تھا جو بعد میں طاہر پرنس کے نام سے معروف ہوا۔ طاہر نفیس اختر راوین تھا اس نے میٹرک میں بہت اچھے نمبر لیے تھے اور گورنمنٹ کالج میں اس نے اپنی ایک تنظیم ''راوین فرنٹ'' کے نام سے بھی قائم کی تھی۔ اس تنظیم نے اسلامی جمعیت طلبہ جیسی تنظیم کو بھی شکست دی تھی۔

طاہر پرنس اپنے علاقے سے کونسلر بھی منتخب ہوا۔ اس نوجوان نے بعد میں اعلان کیا کہ میں غنڈہ گردی چھوڑنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں اس نے وائے ایم سی اے کے تہہ خانے میں ایک ریسٹوران ''Meals'' ہوا کرتا تھا، میں باقاعدہ ایک پریس کانفرنس کی جس میں مَیں بھی شامل تھا اور میرے ساتھ لاہور پریس کلب کے اس وقت کے صدر ہما علی و دیگر بھی موجود تھے۔ یہاں اس نے غنڈہ گردی چھوڑنے اور ایک نئی تنظیم قائم کرنے کا اعلان کیا۔ یہ 1988ء کے اوائل کی بات ہے۔ اس نے اس پریس کانفرنس میں ''جیو اور جینے دو'' کا نعرہ لگایا۔ یہ سلوگن اسی کی ایجاد ہے۔ طاہر پرنس بلال گنج کے علاقوں کا منتخب بلدیاتی نمائندہ بھی تھا۔ اس نے اس پریس کانفرنس میں بندوق پھینک کر قلم تھامنے کا اعلان کیا تھا لیکن جو اس کے سیاسی حریف تھے انہوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کردیا اور آخر کار وہ ملک چھوڑ کر برطانیہ چلا گیا۔

طاہر نفیس پہلی بار گرفتار ہوا تو اس پر پولیس نے تشدد کیا۔ اب اس کے پاس صرف دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ دوبارہ بندوق اٹھالے یا پھر وہ ''شاخ زیتون'' تھام لے۔ لیکن پولیس اور معاشرے کی جو پولیٹیکل رولنگ ایلیٹ ہے اس کے مقابلے میں اس کو یہ سسٹم اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ بندوق پھینک کر ''شاخ زیتون'' تھام لے۔ لہٰذا ان حالات میں اس نے ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ دیا۔

اسی فہرست میں ایک نام باؤ وارث کا ہے۔ یہ لاہور میں جنرل ایوب خان اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے دوران بطور ''پہلوان'' بہت مشہور ہوا۔ میں جب ان سے ملا تو وہ اس وقت پولیٹیکل فگر بن چکے تھے۔ یہ 1985ء کی بات ہے۔ اس وقت انہوں نے کرشن نگر میں اپنی مارکیٹ بنائی تھی۔ اسی طرح میں نے سلیم نمبردار کو دیکھا کہ اس نے بھی منفی سرگرمیاں چھوڑ دیں اور پھر راج گڑھ میں ''نمبرداروں کی مسجد'' کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ سلیم نمبردار اکثر اوقات مسجد کے باہر کرسی پر بیٹھا ہوتا اور جونہی نماز کا وقت ہوتا، مسجد کے اندر چلا جاتا۔

منشیات فروشوں کا الیکشن کے لیے زرِاعانت

لاہور کا ایک بہت بڑا کردار ''ٹیپو ٹرکاں والا'' تھا۔ یہاں پر اب دو اور کردار یاد آ گئے ہیں جو منشیات فروشی کے حوالے سے معروف تھے۔ یہ دو بھائی تھے: ایک کا نام تھا ''فیجا'' اس کا اصل نام حفیظ تھا اور اس کے دوسرے بھائی کا نام ''نجا'' تھا۔ یہ دونوں بھائی لاہور کے ''ڈرگ لارڈز'' تھے۔

رانا چیمبرز جو ان دنوں جاوید ہاشمی کی سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا، اس کے ایک کمرے میں دو موٹے موٹے آدمی ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو میں دسمبر 1976ء سے الیکشن تک مسلسل

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

دیکھتا رہا۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں ہاں اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کوئی ''صحت مند'' سے بندے ہیں جو ملتان سے آئے ہیں۔ ایک دن مجھے کہا گیا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ جائیں اور شاہ عالمی چوک میں جا کر ''بلے'' نامی شخص سے ملیں۔ خیر میں ''نجے'' کے ساتھ وہاں پہنچا اور وہاں سے ہم الیکشن کمپین کے لیے ایک اچھا خاصا ''زرِ اعانت'' لے کر آئے۔

1978ء سے 1980ء تک جو لوگ اس میدان میں مشہور ہوئے ان میں پرانی انارکلی میں ایک کردار تھا ''کالے خان''۔ یہ معروف فلم ایکٹر یوسف خان کے بھتیجے تھے۔ کالے خان کے بڑے بھائی کا نام لالہ فرید تھا اور ان کے والد صاحب لاہور ہائی کورٹ کے سینئر وکیل تھے۔ اس کے بعد جو نام چلا وہ انہی دو بھائیوں ''فیجے'' اور ''نجے'' کا چلا جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔

''کالے خان'' کے بعد جو نام معروف ہوئے، ان میں ''کالو شاہ پوریہ'' کا نام تھا۔ یہ تمام لوگ بالآخر برے انجام سے دوچار ہوئے۔ لاہور کی بدمعاشی میں ایک بڑا نام ''رئیس ٹینکی'' بھی گزرا ہے۔ مناقصائی، اشرف ٹیڈی، رئیس کالیا وغیرہ بھی اسی قبیل کے لوگ تھے۔ اب چونکہ میں بلدیات کی سیاست کر رہا تھا تو ان غنڈوں کے خلاف میں عوامی طاقت کے ساتھ اور اللہ پاک نے جو مجھے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت دی تھی اس کے ساتھ میں نے ان کے خلاف جنگ کرنا تھی۔ میں نے ہمیشہ سچی بات کہنے اور کسی کو للکارنے سے کبھی تامل نہیں کیا۔

میں اپنے بلدیاتی حلقے سے دو مرتبہ 1987ء اور 1991ء میں کونسلر منتخب ہوا اور ایک مرتبہ لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن میں ڈپٹی ایوان قائد بنایا گیا تو اس دور میں مَیں نے اپنے حلقے میں ان پہلوانوں، بدمعاشوں اور ڈرگ مافیاز کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ بالخصوص منشیات فروشوں کے خلاف میں ہمہ وقت میدانِ عمل میں رہا اور اپنے علاقے سے اس لعنت کو ختم کرنے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کردار ادا کیا۔ اسی موقع پر مجھے ظفر علی روڈ پر واقع امریکی قونصلیٹ میں قونصل جنرل نے باقاعدہ بلایا اور منشیات فروشوں کے خلاف میری کوشش کو سراہتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس مافیا کی بیخ کنی کیسے کی تو میں نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ''زور خطابت'' اور عوامی طاقت کے ساتھ ایسا کیا جس میں مجھے کامیابی ملی۔

میاں نواز شریف کی تحریک نجات

جب میں چوتھی بار 1993ء میں گرفتار ہوا، اس وقت میرے ساتھ یہ منسوب کر دیا گیا تھا کہ میرا تعلق مسلم لیگ نواز سے ہے۔ 1993ء میں جب منظور احمد وٹو صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اور نواز شریف نے حکومت کے خلاف ''تحریک نجات'' کا اعلان کرتے ہوئے مورخہ 19 اکتوبر کو ایک جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا تو اس موقع پر منظور احمد وٹو اپنے بیٹے معظم وٹو کی شادی سے جونہی فارغ ہوئے تو انہوں نے پہلا ''نادر شاہی'' فرمان یہ جاری کیا کہ لاہور شہر چونکہ نواز شریف کا سیاسی گڑھ ہے اور یہاں سے تحریک نجات کامیاب ہو سکتی ہے تو لاہور شہر کے لوگوں کو سڑکوں پر لانے میں جو لوگ رول پلے کر سکتے ہیں، ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ لہٰذا اس ضمن میں ایک ''موہوم'' سے خدشے کے پیش نظر جبکہ میرا نواز شریف کے ساتھ کوئی تعلق ہرگز نہ تھا اور

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کبھی نہیں رہا تھا اور میں نے دونوں بلدیاتی الیکشن بھی ان کے خلاف لڑے تھے اور صوبائی الیکشن میں میاں نواز شریف کے خلاف عبید اللہ شیخ کو کھڑا کر کے اس کی بھرپور سپورٹ کی تھی۔ (یہ عبید اللہ شیخ وہی ہیں جنہوں نے 1983ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں طلبہ یونین کا الیکشن لڑا تھا اور صدر منتخب ہوئے تھے)۔

بہرحال نواز شریف کی تحریک نجات میں مجھے بھی بلاجواز گرفتار کر لیا گیا اور اس تحریک کا اولین اسیر بھی میں ہی تھا۔ پولیس جب مجھے تھانے لے گئی تو ایس ایچ او نے کہا: حافظ صاحب آپ کا تو نواز شریف کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حکومتی حکم نامہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے تمام سیاسی مخالفین کو گرفتار کر لیا جائے تو اس خدشے کے پیش نظر آپ کو گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ اگر ہمیں لکھ کر دے دیں کہ آپ مسلم لیگ کے نہیں ہیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ جناب یہ تھانہ اور جیل میرے لیے ہرگز نئے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں نے باقاعدہ سیڑھی لگا کر اور میرے گھر کی چاردیواری کا تقدس پامال کر کے مجھے گرفتار کیا ہے، یہ بات تو آپ کو مجھ سے وہاں پوچھنا چاہیے تھی، اگر آپ وہاں مجھے یہی بات کہتے تو شاید میں آپ کی یہ بات تسلیم کر تا یا نہ کرتا لیکن یہ بات مجھے معقول ضرور لگتی۔ جب آپ نے وقتی طور پر مجھے زبردستی مسلم لیگ نواز کے ساتھ ''نتھی'' کر ہی دیا ہے اور جبکہ میں مسلم لیگ نواز کا مخالف ہوں اور اس کے ساتھ اینٹی بھٹو بھی ہوں لیکن اب میں ان حالات میں اینٹی پی پی بھی ہوں اور اینٹی پی پی بھی ہوں۔ اب میں مسلم لیگ کا ساتھ دوں گا اور کوئی معافی نامہ، معذرت نامہ یا تلافی نامہ ہرگز نہ لکھوں گا۔ کیونکہ

پھر سے استاد محترم آغا شورش کاشمیری نے کہا تھا کہ: ''معذرت خواہ مردان اولوالعزمی نہیں ہوتے''۔ میری گرفتاری پر مسلم لیگ ہاؤس ڈیوس روڈ پر منعقدہ ایک اجلاس میں میاں محمد نواز شریف نے کہا کہ: ''میں بلدیہ عظمیٰ لاہور کے اپنے قائد ایوان حافظ شفیق الرحمٰن کی گرفتاری کے موقع پر چادر اور چاردیواری کے تقدس کی پامالی کی مذمت کرتا ہوں''۔ میں اس موقع پر پندرہ دن کیمپ جیل میں رہا۔

آغا شورش کاشمیری سے ارادت مندی

استاد محترم آغا شورش کاشمیری کے ذکر سے یاد آیا کہ ان سے میری پہلی ملاقات بطور سامع پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہوئی تھی۔ ہمارے گھرانے میں ان کا اکثر ذکر رہتا تھا کیونکہ ہمارے گھر ان کا جریدہ ''چٹان'' مستقل آیا کرتا۔ والد صاحب ختم نبوت کے حوالے سے آغا صاحب کے غیر متزلزل موقف کی وجہ سے ان سے عقیدت رکھتے تھے اور دوسری بات یہ ہے کہ آغا صاحب کا جو علمائے کرام کے ساتھ تعلق تھا اس کی وجہ سے بھی والد صاحب ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یہ 21 اپریل 1970ء کی بات ہے کہ یونیورسٹی ہال میں ''مرکزیہ مجلس اقبال'' کا جلسہ تھا اور چھٹی والے دن والدہ مجھے گوشت لانے کے لیے بھیجتی تھیں۔ اس وقت بکرے کا معیاری گوشت انارکلی میں پرانی ٹولنٹن مارکیٹ سے ملتا تھا۔ میں راج گڑھ اپنے آبائی علاقہ سے ٹولنٹن مارکیٹ پہنچا اور جب وہاں سے گوشت لے کر باہر نکلا تو اولڈ کیمپس کے باہر ایک ہجوم دیکھا۔ جیسا کہ بچوں میں ایک تجسس ہوتا ہے اور میں بھی اسی تجسس کے سبب ہجوم کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس سائیکل تھی اس

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

زمانے میں شاپر نہیں ہوتے تھے اور تھیلا ہوتا تھا ۔ میں نے تھیلا ہاتھ میں پکڑا اور لوگوں سے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو لوگوں نے مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسے کے متعلق بتایا۔ اسی اثنا میں میرے کانوں میں ایک آواز آئی:

''دوستو! یہ مرکزیہ مجلس اقبال کا اجتماع ہے۔ یہاں آپ نے انتہائی مودب انداز میں بیٹھنا ہے۔ اس مودب انداز اور منظم انداز میں بیٹھنا ہے کہ ہر کہ ومہ جو آپ کو دیکھے تو وہ آپ کو جیتے جاگتے انسانوں کا ایک ہجوم یا مجمع نہ سمجھے بلکہ اسے یوں محسوس ہو کہ جیسے کسی کہنہ مشق شاعر نے چھوٹی بحر کی مرصع غزل میں قافیوں کے ساتھ ردیفوں کی لڑیاں پرودی ہوں''۔

یہ الفاظ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن حافظہ اچھا تھا کہ جو بات بھی سنتا تھا وہ میرے ذہن میں نقش کالحجر ہو جاتی تھی۔ اس سے مجھے تجسس پیدا ہوا۔ میں تو چونکہ اپنے والد کے ساتھ مختلف خطباء کو سنا کرتا تھا اور میں نے ان کے ساتھ مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا غلام غوث ہزاروی، علامہ خالد محمود، علامہ عنایت اللہ گجراتی، مولانا ضیاء القاسمی، مولانا محمد عمر پالن پوری، سید ابو معاویہ بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن آلومہار شریف، مولانا محمد عمر اچھروی، (بریلوی سکول آف تھاٹ کے ایک بڑے مناظر)، علامہ رشید ترابی اور نصیر الاجتہادی کو سنا جو کہ بہت بڑے شیعہ ذاکر تھے۔

بہر حال اب میں نے شورش صاحب کے یہ الفاظ سنے تو میں نے سوچا کہ ایسے الفاظ تو میں نے کسی کے ہاں نہیں سنے اور اس طرح کی بات تو کسی نے نہیں کی۔ چٹان پڑھ پڑھ کر میرا ادبی ذہن تو بن گیا تھا اور اب ان کے الفاظ اور بیان کی بنت اور تقریر کا ایک بہاؤ اور ان کا اسلوب اور قرینہ تھا جو میرے ذہن کے اندر خوبصورت احساس پیدا کر رہا تھا اور ایک شوق پیدا کر رہا تھا کہ خطابت ایک باقاعدہ فن ہے۔ تقریر محض الفاظ کی بارش کر دینے کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں آپ کو اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے لہجے کے زیر و بم سے ایک ایسا تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سامعین کے دل میں آپ کی بات یوں اتر جائے جیسے صبح کے وقت ''شاخ گل'' میں ''شبنم کا رس'' ڈھل جاتا ہے۔

اس جلسہ کی صدارت جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید مودودیؒ کر رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اسی پروگرام میں ان کی زیارت کی۔ مرکزیہ مجلس اقبال کے سٹیج سیکرٹری بھی آغا صاحب خود ہی ہوتے تھے۔ جب آغا صاحب نے مولانا مودودی کو تقریر کے لیے دعوت دی، تو کہا: ''سامعین اب آپ کے سامنے عالم اسلام کے ایک جید سکالر اور بین الاقوامی سطح پر مسلمہ علوم شرقی و غربی کے ماہر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اظہار خیال کریں گے۔ فکر اقبال کے حوالے سے ذکر اقبال ان کی زبان بلاغت سے سنیے گا اور میں یہ چاہوں گا کہ آپ ان کی گفتگو اس طرح خاموشی سے سنیں کہ جیسے رات کا سناٹا چمکتے ہوئے ستاروں کی کتھا سنا کرتا ہے''۔

آغا صاحب کا یہ جملہ بھی میرے ذہن میں نقش ہو گیا۔ یوں میں نے پہلی مرتبہ دونوں بڑی شخصیات کو ایک ہی موقع پر دیکھا اور ان کو سنا۔ میرا خاندانی پس منظر دیوبند مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا جو مولانا مودودی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ بہر حال اب میں نے وہاں آغا صاحب کی زبان سے ان کی اس حد تک تعریف سنی تو میرے ذہن میں از خود ان کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یاد پڑتا ہے کہ 1972ء میں جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں مختلف انٹر کالج ڈبیٹس اور انٹر یونیورسٹیز ڈبیٹس میں حصہ لیتا تھا اور انعامات کا کوئی ایک درجہ ایسا نہیں تھا جو میں نے حاصل نہ کیا ہو۔ میں نے گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔ میں نے ٹرافیز لیں اور شیلڈز بھی حاصل کیں۔ میں نے سلور میڈل بھی حاصل کیے، میں نے حوصلہ افزائی کا بھی انعام حاصل کیا۔ میں نے یونیورسٹی سطح کیمانے ہوئے مقررین کے ہجوم میں اپنی ڈبیٹس کا آغاز کیا تھا۔ میرے ذہن میں رول ماڈل اور جو آئیڈیل تھا وہ آغا صاحب ہی کا اسلوب تھا۔ ان کی خطابت تھی۔ 70ء کے جب الیکشن ہوئے تو ان دنوں کوئی ایسا موقع میں نے نہیں جانے دیا کہ جب آغا صاحب کی کہیں تقریر ہو اور میں انہیں سننے کے لیے نہ پہنچا۔ مجھے اگر پتہ چلتا کہ سلطان پورہ یعنی شمالی لاہور میں جلسہ ہو رہا ہے تو میں وہاں پہنچ جاتا تھا ۔ یہ میرا آغا صاحب سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا اور مجھے جنون کی حد تک ان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ جب پتہ چلتا کہ جلو یا باٹا پور کے علاقے میں کہیں جلسہ ہے تو میں وہاں سائیکل پر پہنچ جاتا۔ کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں آغا صاحب کی تقریر ہوئی ہو اور میں وہاں نہ پہنچا ہوں اور میں نے اپنے دامن سماعت میں ان کی خطابت کے جو موتی ہیں ان کو نہ سمیٹا ہو۔

ایک تعزیتی ریفرنس

مجھے یاد پڑتا ہے کہ 1973ء میں مشرق اخبار کے ایڈیٹر ضیاء الاسلام انصاری تھے۔ اس کے بانی عنایت اللہ تھے۔ (یہ عنایت اللہ حکایت والے نہیں تھے)۔ عنایت اللہ ''کوہستان'' اخبار سے آئے تھے۔ اس دور میں کاتب اخبارات کے دفاتر میں نیچے چٹائیوں پر بیٹھا کرتے تھے اور پہلی مرتبہ عنایت اللہ مرحوم نے جدت یہ پیدا کی کہ ان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر مشرق اخبار جس انداز سے انہوں نے نکالا اور اس کے رنگین ایڈیشن شائع کیے اس کی آج تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس زمانے میں گرافکس اور کتابت کے وہ آلات اور وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو آج کل میسر ہیں، تب بھی انہوں نے اس دور میں بہت جدت پیدا کر دی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک وژنری انسان تھے۔

مشرق اخبار میں کاتبوں کی ایک تنظیم تھی جس کے صدر ملک نور ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یار آپ آئیں اور ہمارے عنایت اللہ صاحب کی برسی کے موقع پر ہونے والے ''تعزیتی ریفرنس'' میں اظہار خیال کریں۔ یہ پروگرام جناح ہال میں ہوا جس کو ٹاؤن ہال بھی کہا جاتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے بارے میں معلومات مجھے ملک نور اللہ صاحب نے فراہم کیں اور میں نے ان کو اپنے انداز میں خطابتی اور تقریری اسلوب میں ڈھال کر تقریر کر دی۔ اس جلسہ میں جن مقررین نے تقریریں کی ان میں آغا شورش کاشمیری، سیاستدان نبیل گبول کے والد سردار عبدالستار گبول اور دیگر بڑے حضرات شامل تھے۔ اس جلسہ کی صدارت ممتاز بیوروکریٹ اور شہاب نامہ کے خالق قدرت اللہ شہاب کر رہے تھے۔ میں نے جب تقریر کی تو اس وقت تک آغا صاحب نہیں پہنچے تھے۔

میں نے عنایت اللہ مرحوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے صحافیوں حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کا ذکر کیا وہاں میں نے آغا صاحب کا بھی ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ لوگ تو

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

with CamScanner

ماضی مرحوم کی نذر ہو گئے ہیں اور اب ہم اس خوش قسمت دور میں زندہ ہیں جہاں اس وقت قبیلہ صحافت کی سرداری آغا شورش کاشمیری کے پاس ہے۔ یوں میرے دل میں ان کی جتنی ارادت اور عقیدت تھی اور جتنے بہترین الفاظ میں اس عقیدت کو بیان کر سکتا تھا وہ بیان کر دی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ آغا صاحب کب آئے اور آ کر سٹیج پر بیٹھ گئے۔ جب میں تقریر کر کے ہٹا تو سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب آغا صاحب تقریر کریں گے۔ آغا صاحب سٹیج پر آئے، یہ میری ان سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ تقریر کے لیے مائیک پر آتے تو ان سے پہلے جتنے بھی مقرر تقریر کر چکے ہوتے، وہ ایک ایک کا نام لیتے اور ہر ایک کے بارے میں ایک آدھ تحسینی جملہ ضرور کہتے۔ انہوں نے میرے بارے میں کہا کہ اسلامیہ کالج کے جس نوجوان نے تقریر کی ہے میں اس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تحسینی جملہ نہیں کہتا اس لیے کہ اس نے اپنی تقریر میں مجھے بے تحاشا خراج تحسین پیش کیا ہے اور میں بھی اس کی تعریف کروں گا تو یہ عمل رشوت کے زمرے میں آ جائے گا۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب یہ تقریب ختم ہو جائے تو وہ مجھے ضرور مل کر جائے۔ چنانچہ جب تقریب ختم ہوئی اور میں ان سے ملا تو انہوں نے کہا کہ بچے بات یہ ہے کہ میں فن خطابت پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ کتاب کوئی پڑھے نہ پڑھے تم ضرور پڑھنا۔ کیونکہ میں تمہارے اندر بہت سی اہلیتیں اور صلاحیتیں دیکھ رہا ہوں اور خطابتی حوالے سے کمزوریاں بھی دیکھ رہا ہوں۔ جب تم وہ کتاب پڑھو گے تو ایک اچھے خطیب کی صورت میں سامنے آؤ گے۔ اور ایک بات یاد رکھنا کہ صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک خاص شعبہ کا مطالعہ کرے، ڈاکٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو اپنی پروفیشنل ایجوکیشن تک محدود رکھے۔ شعراء کے لیے ضروری ہے کہ وہ متقدمین اور متاخرین شعراء اور متوسطین کا کلام پڑھیں لیکن ایک خطیب پر لازم ہے کہ وہ ادب بھی پڑھے، ناول بھی پڑھے، افسانہ بھی پڑھے، کہانی بھی پڑھے، اداریہ بھی پڑھے، مطائبات بھی پڑھے، انشائیہ بھی پڑھے، فکاہیہ بھی پڑھے، پابند نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ، نثری نظم، غزل، رباعی، ہزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس بھی پڑھے اور مسدس بھی۔ غرض ایک خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر موضوع پر کتب کا مطالعہ کرے اور جو بھی کتاب اسے میسر ہو اسے پڑھ ڈالے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات کا احوال ہے۔ اس کے بعد بھی خواجہ افتخار صاحب جو کہ ''امرتسر جل رہا ہے'' کے مصنف تھے ان کی وساطت سے میں ایک بار آغا شورش صاحب سے ملا تو خواجہ صاحب نے اس موقع پر آغا صاحب کو میری اس تقریر کے متعلق بھی بتایا جو میں نے مولانا کوثر نیازی کی موجودگی میں بھٹو صاحب کے خلاف کی تھی۔

دیکھیں اصل بات یہ نہیں کہ آپ کی کسی بڑی علمی اور ویژنری شخصیت سے کتنی طویل رفاقت رہی اور اس کی کتنی صحبتیں اختیار کیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ نے کسی بڑی شخصیت کی تعلیمات کو کس قدر اپنایا اور اس کے تبحر علمی سے کتنا فائدہ اٹھایا۔ اصل چیز کسی رائٹر یا ادیب و خطیب کے وہ رشحات فکر ہوتے ہیں جو کتابی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ میں نے آغا صاحب کی کوئی ایسی شاعری یا نثری کتاب نہیں ہوگی جسے بار بار نہ پڑھ لیا ہو۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

1949ء سے 1955ء تک تو میں نے ان کے تمام چٹان والے اداریے پڑھ لیے تھے۔ اس کے بعد 1970ء سے لے کر اکتوبر 1975ء یعنی ان کی وفات تک جتنے بھی چٹان کے اداریے تھے، ان کا جو کالم تھے، جتنی ان کی دوسری تحریریں، شذرات چھپے وہ سارے کے سارے میں نے پڑھے اور صرف پڑھے ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے اندر سمویا اور اپنے اندر جذب کیا اور بہت کچھ سیکھا۔ یوں میری آغا صاحب کی زندگی میں تو ان کے ساتھ چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن ان کے وصال کے بعد ان سے ہر شب جو ملاقاتیں ہوتی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ آج بھی میرا یہی معمول ہے کہ میں ان کی روزانہ کوئی نہ کوئی تحریر پڑھتا ہوں۔

جب 1975ء میں آغا صاحب کی وفات ہوئی تو میں ان کے جنازے میں شریک تھا۔ یہ لاہور کا بہت بڑا جنازہ تھا۔ میں نے بہت سے جنازوں میں شرکت کی۔ مجھے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی نماز جنازہ بھی یاد ہے جو یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھائی گئی۔ یونیورسٹی گراؤنڈ جین مندر سے شروع ہوتی ہے اور چوبرجی تک جاتی ہے۔ یہ ساری گراؤنڈ اس کی سامنے والی سڑکیں، ملتان روڈ والی سڑک، لیک روڈ' غرض ہر طرف خلقت ہی خلقت تھی۔ مولانا کے جنازے کی چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس لگائے گئے تھے۔ لوگ ان کو چھو کر گزر جاتے۔ یہ لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور مجھے والد صاحب نے بغلوں سے اٹھا کر اوپر کیا کہ دیکھو کتنے لوگ ہیں۔ تو وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔ دوسرا جنازہ جو میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑا تھا وہ آغا صاحب کا تھا۔ یہ بھی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوا۔ بڑے بڑے سیاستدان، صحافی، مشاہیر اور عام لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ تیسرا بڑا جنازہ جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تھا۔ اسی طرح چوتھا بڑا جنازہ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ خواجہ سعد رفیق کے والد گرامی خواجہ رفیق شہید کا تھا۔ ہمارے بزرگ بتایا کرتے ہیں کہ لاہور کی تاریخ کا ایک بہت بڑا جنازہ 1929ء میں غازی علم دین شہیدؒ کا تھا۔

مولانا مودودیؒ کی مجلس میں

جب میں طلبہ یونین کا نائب صدر تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ کے دفتر واقع۔ پانچ اے ذیلدار پارک، اچھرہ جانا ہوتا تو اس دفتر کے بالمقابل مولانا مودودیؒ کی رہائش تھی جس کے صحن میں نماز عصر کے بعد مولانا کی روزانہ کی مجلس ہوتی تھی، اس میں مَیں شریک ہو جاتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ میری تو کبھی جرات بھی نہیں ہوئی کہ میں مولانا جیسے عظیم انسان سے مخاطب ہوسکوں۔ میں تو بس ان کی زیارت کرتا رہتا اور خاموش رہتا۔ ان سے میں نے کبھی کوئی سوال جواب یا استفسار نہیں کیا۔ ہم سے سینئر لوگ وہاں پر موجود ہوتے تھے جو بات چیت کرتے تھے۔ ہم تو بس مولانا کی باتیں نہایت ادب اور احترام کے ساتھ سنتے رہتے۔ مولانا انتہائی سادہ، وضع دار تھے اور دکن کی تہذیب کا شائستہ ترین شاہکار تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں پڑھیں، چونکہ میں نے ابوالکلام آزاد سے شروعات کی تھیں اور جب میں نے مولانا مودودی کو پڑھا تو پھر مجھے سلیس اردو پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب تفہیم القرآن کا انگریزی ترجمہ الطاف گوہر نے کیا تو لاہور ہی میں ایک ہوٹل میں تقریب ہوئی تو اس موقع پر اے کے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بروہی نے ایک بات کہی تھی کہ قرآن ''عربی مبین'' میں نازل ہوا تھا اور سید مودودی نے اس کی تشریح تفہیم القرآن کے روپ میں ''اردوئے مبین'' میں کر دی۔

میرے محلے کی تاریخی ہستیاں

میرے محلے راج گڑھ کے قریب کا محلہ اسلام پورہ تھا۔ اس کا اصل نام کرشن نگر ہے۔ ناصر کاظمی یہیں کے رہنے والے تھے لیکن جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت وہ حیات نہیں تھے۔ اس دور میں کرشن نگر میں جو ایک ادبی آستانہ تھا اور جہاں سے فکر و نظر کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں وہ پروفیسر مرزا منور کا تھا۔ میں نے وہاں حاضری دینا شروع کی۔ پروفیسر مرزا منور جامع العلوم شخصیت تھے۔ عربی شاعری پر عبور تھا۔ وہ ہم جیسے عام طالب علموں کو بھی سمجھانے کے لیے عربی اشعار پڑھتے اور پھر ہم سے سنتے بھی۔ وہ ان اشعار کی تشریح کرتے اور پھر کہتے کہ اسے لکھ لو اور یاد کر لو۔ ہم ان کے حکم کی تعمیل کرتے اور جب بھی ان کے ہاں جانا ہوتا ایک ڈائری اپنے ساتھ لے لیتے۔ یہ کسی انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ بچپن ہی میں اسے ایسے لوگ مل جائیں یا ایسے لوگوں کو اپنے گرد و پیش، آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھ لے۔ جس محلے میں میں رہتا تھا اس میں مولانا چراغ حسن حسرت کے بیٹے ظہیر جاوید رہتے تھے۔ ان سے ہمارے گھریلو تعلقات تھے۔ وہ میرے والد صاحب کے شاگرد تھے۔ مولانا کی بیگم بھی میرے والد کی شاگردہ تھیں۔ ہم ان کو دادی اماں کہتے تھے اور ظہیر جاوید کو ہم بھائی جان کہا کرتے۔ یہ غالباً 1969ء کی بات ہے اور یہ اس زمانے میں ''امروز'' اخبار میں ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا امروز کی وجہ سے لاہور سے شائع ہونے والے تمام اخبارات کی فائل ان کے ہاں آیا کرتی۔ وہ دفتر چلے جاتے تھے اور فائل میرے والد صاحب کو مطالعہ کے لیے دے جاتے۔ یوں مجھے اپنے گھر پر ہی لاہور سے شائع ہونے والا ہر اخبار اور ہر جریدہ میسر آتا اور میں خوب مطالعہ کرتا۔

راج گڑھ ہی میں ایک صاحب ''شرقی بن شائق'' رہتے تھے، وہ پیپلز پارٹی کے بڑے مداح تھے۔ مرتضیٰ بھٹو نے جب طیارہ ہائی جیک کیا اور اس کے بعد پیپلز پارٹی کے جن لوگوں کی رہائی کا مطالبہ ہوا تھا ان میں شرقی بن شائق کے بھائی بھی شامل تھے۔ انہیں سب لوگ ''ماسٹر غن غناں'' کہا کرتے کیونکہ وہ ناک میں بولتے تھے۔ یہ بڑا ادیبانہ ذوق رکھتے تھے۔ محلے میں میرے صحافتی شوق کو مہمیز دینے والوں میں جناب زبیر احسان قریشی میرے دوست بھی تھے اور استاد بھی۔ ان کے بیٹے سلمان قریشی لاہور پریس کلب کے عہدیدار بھی رہے۔ میرے گھر سے پانچ منٹ کے فاصلے پر مولانا کوثر نیازی کا نو تعمیر شدہ گھر تھا۔ مولانا کو ہم شیروانی، پاجامہ اور قراقلی ٹوپی پہنے راج گڑھ روڈ پر آتے جاتے دیکھا کرتے۔ ہم راج گڑھ سے یونیورسٹی گراؤنڈ پڑھنے جاتے تو بیچ میں ریواز گارڈن آتا تو کبھی راستے میں ہمیں پروفیسر برہان احمد فاروقی ترکی ٹوپی پہنے، علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے نظر آتے یا کبھی وہ پنجاب پبلک لائبریری یا اورینٹیل کالج کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ یہیں پر ہم نے سید اسلام شاہ کو دیکھا جو ریڈیو پاکستان کے پروگرام منیجر تھے۔ بعد میں کسی بڑے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ یہ موسیقی پر خوب مہارت تامہ رکھتے تھے اور میرے ساتھ ان کا تعلق اس لیے بن گیا کہ وہ بھی میرے والد کے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شاعر تھے۔ سید اسلام شاہ راج گڑھ چونگی کی نکڑ پر رہتے تھے۔ ان کا کوٹھی نما بڑا اچھا گھر تھا۔ وہ انبالہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کے گھر کے باہر پتھر کا ایک بینچ رکھا ہوتا تھا اس پر مولانا کوثر نیازی ٹیک لگا کر بیٹھے ہوتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان مجھے یہ بتائیں کہ یہ مولانا کوثر نیازی آپ کے پاس کیوں آتے ہیں، وہ تو جماعت اسلامی کے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ریڈیو پاکستان کا پروگرام لینے کے لیے آتے ہیں اور میں چونکہ پروگرام منیجر ہوں تو یہ میرے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں تاکہ ان کو ایک پروگرام مل جائے، جس کا معاوضہ چالیس روپے ہوتا ہے۔ میں 70ء تک ان کو باقاعدہ حاضری بھرتے دیکھتا رہا۔

راج گڑھ اور آس پاس کا یہ سارا علاقہ بڑا مردم خیز خطہ تھا۔ سانده روڈ پر ایک کوٹھی نما گھر میں جب منو بھائی تازہ تازہ منتقل ہوئے تو ہم ان کو اکثر اس علاقے میں دیکھا کرتے۔ اسی طرح ریواز گارڈن کے عوامی فلیٹس میں مَیں نے استاد طالب جالندھری جیسے بڑے آدمی کو دیکھا۔ اسی علاقے میں ہماری ملاقات ڈاکٹر تبسم رضوانی سے ہوئی اور ان کی ادبی محفلوں میں مَیں نے زیبا ناروی کو دیکھا، یہیں پر ہماری ملاقاتیں بیدار سرمدی سے ہوئیں جو نوائے وقت میں رہے۔ یہ بڑے رائٹر اور ادیب ہیں۔ یہاں استاد پھل آگروی سے جو استاد ثمر اکبر آبادی کہلاتے تھے سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ اسی علاقے میں پیام شاہجہان پوری سے ملا، حکیم ولی الرحمٰن ناصر سے ملا۔ ''اسلامی جمہوریہ'' کا جو ڈیکلریشن تھا وہ منصور طیب کے نام پر تھا، یہ بھی ریواز گارڈن میں رہتے تھے۔ حمید جہلمی بھی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ یہ اکبر علی بھٹی کے دور میں روزنامہ پاکستان کے گروپ ایڈیٹر رہے۔ ممتاز ادیب حمید اختر بھی اسی علاقہ میں کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی طرح ایک بہت بڑا نام ہے سید عبدالصبور طارق، یہ بھی ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ میں جب میٹرک میں تھا تو انہوں نے ایک بزم ادب بنا رکھی تھی وہ اس کے صدر تھے۔ وہ ملٹری اکاؤنٹس سے ڈائریکٹر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں رکھی ہوتیں۔ ان کو پورے محلے کے بچے ماموں جی کہا کرتے۔ 1985ء سے 1988ء تک نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جتنی بھی کتابوں پر اول انعام دیا گیا وہ سید عبدالصبور طارق ہی کی کتابوں کو ملا۔ تاریخ پر انہیں بڑا عبور تھا۔ بہت اچھے مترجم تھے، لین پول اور دوسرے لوگوں کے انہوں نے ترجمے کیے تھے۔ میں ان کی محفلوں میں بیٹھا کرتا۔ جب میں میٹرک میں تھا تو سید عبدالصبور طارق صاحب کے اس حلقہ احباب ادب میں کئی بڑے ادیبوں کو ملنے کا موقع ملا۔ پروفیسر مرزا منور، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور استاد احسان دانش آیا کرتے۔ نوائے وقت کے کالم سرراہے کے لکھاری پروفیسر سلیم میر ہمارے گھر کی عقبی گلی میں رہتے تھے ان کو بھی میں آتے جاتے دیکھا کرتا اور لوگوں سے سنا کرتا کہ یہ بہت بڑے صحافی اور رائٹر ہیں۔ یوں بچپن ہی میں میرا ایک خاص ادبی اور صحافتی ذوق بن گیا تھا۔

حضرت احسان دانش/ ڈاکٹر برہان

احمد فاروقی/عباد علی شاہ

احسان دانش کے متعلق مجھے یاد ہے کہ انتہائی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سادہ اور درویش طبع انسان تھے۔ میں ان کے پاس بہت سی کتابیں دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ جب میں حفظ کر رہا تھا اور نیلا گنبد مدرسے میں جایا کرتا تو راستے میں بائبل سوسائٹی کے قریب فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے سٹال لگے ہوتے تھے۔ میں اکثر دیکھتا کہ استاد دانش کھدر کا سوٹ، پاجامہ اور صدری نما واسکٹ پہنے اکڑوں بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کر رہے ہوتے تھے۔ یہیں میں نے پروفیسر برہان احمد فاروقی صاحب کو بھی دیکھا۔ 71ء میں جب میں پنجاب پبلک لائبریری جانا شروع ہوا تو وہاں بھی اکثر استاد احسان دانش کو دیکھا کرتا۔

میں نے 1978ء میں ''اسلامی جمہوریہ'' جریدے کے لیے استاد احسان دانش کا انٹرویو بھی کیا تھا جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ جب 1947ء میں قیام پاکستان عمل میں آ گیا تو سیکریٹریٹ کا بیش قیمت مواد ایسا تھا جسے انگریز اور ہندوؤں نے جاتے جاتے خفیہ طریقے سے نذر آتش کر دیا تھا۔ اس کے باوجود سیکرٹریٹ کی کچھ خفیہ فائلیں بچ گئی تھیں جو اب صرف میرے پاس ہیں جن میں لکھا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز پنجاب پر قابض ہوا تو پنجاب کے کن کن جاگیرداروں کو صلے میں کیا کیا دیا گیا۔ ایک تو ''چیفس آف پنجاب'' یا روسائے پنجاب'' و دیگر کتابوں میں بھی ان خاندانوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن احسان دانش کہتے تھے کہ میرے پاس تو اصل ماخذ ہیں اور ان فائلوں میں سب کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ کس کو کیا دیا گیا۔

دوستوں اور شخصیات کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یاد آیا کہ جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ طلبہ یونین کا نائب صدر تھا تو اس وقت یونین کے صدر عباد علی شاہ تھے۔ عباد علی شاہ صاحب بیوروکریٹ کی حیثیت سے پٹرولیم کے ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ہماری یونین کے جوائنٹ سیکرٹری عبدالجبار بٹ صاحب تھے جو آج کل جبار پیپر مل کے مالک ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا اور بڑا بھرپور وقت گزرا۔

آغا شورش پر میری پہلی تحریر

آغا شورش کاشمیری کی وفات کے بعد ان کے بچوں سے میل ملاقات رہی۔ چونکہ ہمارے گھر میں ہر ہفتے ''چٹان'' اخبار باقاعدہ آتا تھا تو ایک دن اخبار میں اشتہار نظر سے گزرا کہ آغا شورش کاشمیری کی یاد میں ''چٹان'' کا ایک خاص نمبر شائع کیا جا رہا ہے اور جو حضرات ان پر مضامین لکھنا چاہیں وہ فلاں تاریخ تک ہمیں بھیج دیں۔ میں نے سوچا کہ میں آغا صاحب پر کیسے مضمون لکھوں کیونکہ میں تو طالب ہوں اور کوئی اتنا بڑا عالم فاضل یا ناقد نہیں کہ ان کی قد آور شخصیت اور ان کے فن کا محاکمہ کر سکوں۔ ہاں ایک شعبہ ہے کہ جس سے میں منسلک ہوں اور تحریک ختم نبوت میں جس فن میں کچھ نکھار آ گیا تھا تو وہ تھا خطابت۔ یوں میں نے آغا صاحب پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: ''آغا شورش کاشمیری: اخطب الخطباء''۔ عربی گرامر کی رو سے خطیب کی جو ''سپر لیٹو ڈگری'' ہے وہ ''اخطب'' ہے۔ اسی طرح شاعر ایک عام شاعر کو کہا جاتا ہے اور ''اشعر'' سب سے بڑے شاعر کو۔ بہرحال میں نے اس مضمون میں اپنے علم اور اپنی حیثیت کے مطابق آغا صاحب کو جو بھی خراج تحسین پیش کر سکتا تھا کیا۔ میں یہ مضمون بھیج کر اسے بھول گیا کہ میں کس باغ کی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مولی ہوں کیونکہ اس خاص نمبر میں تو بڑے بڑے لکھاریوں کے مضامین شامل ہوں گے۔

اس کے بعد ایک دن پرچہ آیا تو اس میں یہ اعلان تھا کہ اگلا پرچہ ''آغا شورش کاشمیری نمبر'' ہو گا۔ خیر میں اگلے ہفتے صبح ہی پرانی انارکلی میں کراچی سویٹ کے سامنے ایک بڑے اخبار کے سٹال پر پہنچا اور چٹان حاصل کر کے اس کی فہرست دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ ایک فطری سی بات ہے جو ہر لکھنے والے میں موجود ہوتی ہے کہ جب وہ کسی پرچے کو مضمون بھیجتا ہے اور اس کے بعد وہ پرچہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس میں اپنا نام تلاش کرتا ہے۔ میں نے جب اپنا نام تلاش کرنا چاہا اور مولانا سید مودودیؒ، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، نعیم صدیقی، سید اسعد گیلانی، میرزا ادیب وغیرہ کے نام دیکھے تو ایک بار پھر سوچا کہ میرا مضمون ان بڑے لوگوں کی فہرست میں کہاں سے آ گیا۔ پھر میں نے اگلے صفحات پر ''انڈیکس'' دیکھا تو اس میں آغا صاحب کی یاد میں لکھے جانے والے مضامین کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مثلاً ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت شاعر''۔ ''آغا شورش کاشمیری بحیثیت مدیر''۔ ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت سیاستدان''۔ اسی طرح جب میری نظر ''آغا شورش کاشمیری۔ بحیثیت خطیب'' کے عنوان پر پڑی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سب سے پہلے میرا مضمون تھا۔

اس باب میں اپنے دور کے دو نامور خطیبوں مولانا کوثر نیازی اور علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے مضامین بھی شامل تھے جو میرے مضمون کے بعد تھے۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ مضامین کی یہ ترتیب کس حساب سے ہے، کیونکہ میں تو اس وقت کسی قطار شمار میں نہ تھا تو میرا مضمون پہلے کیوں لگا دیا گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مشاعروں اور جلسوں کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے چھوٹے شعرا اور مقررین کو دعوت دی جاتی ہے اور اس کے بعد سینئر حضرات کو دعوت دی جاتی ہے۔ تو یوں اس ترتیب کو بھی میں نے اسی پر محمول کیا کہ مجھے جونیئر سمجھ کر میرا مضمون پہلے لگایا گیا اور میرے بعد مشاہیر کے مضامین لگائے گئے۔ یوں 1975ء میں ہفت روزہ ''چٹان'' میں یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ اس حوالے سے یہ بڑی ہی خوش نصیبی تھی کہ میرا مضمون پاکستان اور بھارت کے ایک تاریخ ساز جریدے میں شائع ہوا جو کہ اس دور میں اپنی ایک ''پولیٹیکل اور لٹریری ورتھ'' رکھتا تھا۔ پھر اسی دور میں میرا باقاعدہ صحافتی سفر شروع ہو گیا۔ یوں آج (2019ء) جبکہ 44 برس بیت رہے ہیں میں اس نجدِ صحافت میں آبلہ پائی کر رہا ہوں۔

یہاں بتاتا چلوں کہ یہ میرا پہلا مضمون نہیں تھا۔ اس سے قبل جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مولانا محمد عمر اچھرویؒ کا انتقال ہوا۔ اب میں نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی جو دیوبند فکر سے متعلق تھا لیکن میرے والد انتہائی وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ مجھے تمام علماء اور خطباء کی مجالس میں لے جاتے تھے اور وہ ہر مسلک کے علماء و مشاہیر کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی رکھتے۔ وہ کہتے کہ یہ فروعی اختلافات ہیں آپ اس میں نہ پڑنا۔ میں نے مولانا محمد عمر اچھرویؒ کی یاد میں اپنا پہلا مضمون روزنامہ مشرق کے لیے لکھا۔ میرا مضمون مشرق کے ادارتی صفحہ پر موجود تھا۔ میں نے اخبار کو اپنی تصویر اس لیے نہیں بھیجی تھی کہیں بچہ سمجھ کر میرا مضمون رد نہ کر دیا جائے۔ اس مضمون کے ساتھ جو مضمون تھا وہ ممتاز ادیب انتظار حسین کا مستقل کالم ''لاہور نامہ'' تھا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

یعنی اتنی چھوٹی سی عمر میں میری تحریر انتظار صاحب کے شانہ بشانہ شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں مَیں نے ایک مضمون مولانا ظفر علی خان کی یاد میں اس دور کے معروف اخبار ''کوہستان'' کو بھیجا اور وہ بھی چھپا۔ یہ آغا صاحب والا میرا تیسرا مضمون تھا۔

آغا صاحب کے چار بیٹے ہیں: آغا مسعود شورش، آغا محمود شورش، آغا مشہود شورش اور آغا مبشر شورش۔ ان سب کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات رہے۔ آغا مسعود ان دنوں اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں جب کہ آغا مشہود شورش اپنے عظیم والد کے ادبی شہ پاروں کی تسوید و تالیف کے عظیم کام کی تکمیل میں مگن ہیں۔ آغا محمود درویش ہو چکے ہیں، انہیں دو جوان بیٹوں کی موت کے روگ نے گوشہ نشین بنا دیا ہے۔ آغا مبشر کینیڈا میں مقیم ہیں اور وہیں اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ 1978ء کی بات ہے کہ چٹان بلڈنگ کے نیچے والے فلور پر ایک محفل لگا کرتی تھی، میر محفل آغا محمود شورش ہوا کرتے تھے۔ مَیں، فاروق لغاری کا بیٹا جمال لغاری، خواجہ سعد رفیق اور سلمان رفیق و دیگر احباب بھی اس محفل کے باقاعدہ شرکاء تھے۔ خواجہ سعد رفیق آغا صاحب کے خانوادے کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ جریدہ چٹان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ خواجہ رفیق شہید کی جائے شہادت پر جو پہلی تصویر لی گئی تھی وہ چٹان کے منیجر اور فوٹو گرافر صلاح الدین نے لی تھی۔ یہ صلاح الدین صاحب بھی عجب شخصیت کے مالک تھے، ایک ''ورسٹائل'' انسان تھے۔ ان کا اصل نام محمد حسین تھا اور یہ صلاح الدین کے نام سے معروف ہوئے۔

ڈاکٹر مسکین علی حجازی اور تجمل حسین دل

آغا مسعود ایک دن مجھے کہنے لگے کہ آپ اوپر دفتر میں آ کر بیٹھا کریں اور نیچے والی منزل پر نہ بیٹھا کریں، دفتر آ کر کام کیا کریں۔ خیر میں نے آغا مسعود کے کہنے پر ''چٹان'' میں باقاعدہ آنا جانا شروع کر دیا۔ آغا مسعود اب چٹان کے چیف ایڈیٹر تھے۔ مجھے انہوں نے کہا کہ اس طرف جا کر بیٹھ جاؤ جہاں پر ایڈیٹوریل کے لوگ بیٹھتے تھے۔ میں دن کے ایک بجے کے قریب دفتر پہنچ جاتا۔ ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے سربراہ تھے۔ آغا صاحب کی وفات کے بعد انہوں نے چٹان کی ادارت سنبھال لی تھی۔ حجازی صاحب باری علیگ (مصنف: ''کمپنی کی حکومت'') کے داماد تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بہت ہی درویش منش آدمی تھے، سیکڑوں صحافیوں کے استاد تھے۔ حجازی صاحب نے مجھے کہا، دیکھو تم اداریہ لکھا کرو گے اور مجھ سے راہنمائی لے لیا کرو کیونکہ میری یونیورسٹی کی بھی بہت ذمہ داری ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ میرا گھر کا ٹیلی فون نمبر ہے (اس دور میں موبائل فون تو آیا ہی نہیں تھا)۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس وقت مجھے فون کر لیا کرو اور میں آپ کو تازہ موضوع بتا دیا کروں گا اور اشارات دے دیا کروں گا جن کی بنیاد پر آپ نے اپنا اداریہ لکھنا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے کچھ دن مجھے ایڈیٹوریل نوٹس اپنے پاس بٹھا کر لکھوائے تھے۔ یوں انہوں نے میری تربیت کی۔ میں برجستہ نوٹس ان کو لکھ کر دیتا تو وہ بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ لکھ سکتے ہو، بس مجھ سے مشورہ کر لیا کرو۔ یہ دراصل ان کا بڑا پن تھا اور مجھے سکھانے کا ایک طریقہ تھا۔ یہاں میری ملاقات استاد تجمل حسین دل سے بھی ہوئی، میں نے ان ایسا بسیار نویس کسی کو بھی نہ پایا۔ جو بندھ گیا، سو

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

موتی کے مصداق وہ اپنے مسودے کی شاذ ہی قطع و برید کرتے۔

مسکین حجازی صاحب اپنی ذات میں دانش ورتو بہت بڑے تھے ہی، وہ دانش گر بھی تھے۔ وہ آغا شورش کے شاگرد تھے اور انہوں نے حق شاگردی بھی خوب ادا کیا۔ وہ جس بھی شہر سے لاہور پہلی بار پڑھنے کے لیے آئے تھے تو انہیں آغا صاحب نے اپنی چٹان بلڈنگ میں جو کہ ایک بہت بڑی عمارت تھی میں ایک کمرہ دے دیا تھا کہ یہاں بغیر کرائے کے رہ لیا کرو۔ حجازی صاحب نے اس بات کو ہمیشہ یاد رکھا اور جب 24 اکتوبر 1975ء کو آغا صاحب کا انتقال ہوگیا تو اس دن سے لے کر مئی 1978ء تک مسلسل روزانہ حجازی صاحب چٹان دفتر آتے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ میرا مرشد خانہ ہے، یہاں حاضری دینا لازم ہے۔ وہ اس ساری ذمہ داری کا ایک دھیلا بھی نہیں لیتے تھے۔ استاد کا جو مقام اور مرتبہ تھا وہ مجھے حجازی صاحب سے جاننے کا موقع ملا۔ حجازی صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر استاد زندہ ہے تو آپ اس کی قدم بوسی اور جبین بوسی بھی کریں لیکن جونہی اس کا انتقال ہوجائے تو اس کی اولاد یا اس کے قائم کردہ ادارے سے قطع تعلق کر لیں۔ میں نے ڈاکٹر حجازی صاحب کی سرپرستی میں چٹان میں بہت کام کیا۔ اس دوران تقریباً حجازی صاحب نے صحافت کے ہر شعبے میں کام کرنے کے مواقع فراہم کیے، مجھے جذبہ اور مہمیز دی۔

ملک غلام جیلانی کا تہلکہ خیز انٹرویو

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی کے والد ملک غلام جیلانی کے انٹرویو کے لیے بھی بھیجا۔ (بعض حلقوں کے نزدیک ملک صاحب کا ایک عمومی تعارف یہ بھی تھا کہ:

"He was the first CIA Horse (in Pakistan"

خیر میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ ملک غلام جیلانی جنرل ایوب خان، نواب آف کالا باغ اور بھٹو صاحب کے خلاف ہمیشہ میدان میں رہے۔ میں نے حجازی صاحب سے کہا ملک غلام جیلانی اتنے بڑے آدمی ہیں میں ان کا انٹرویو کیسے کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ جائیں تو سہی، آج آپ پہل کریں۔ یہ میں نے زندگی میں پہلا انٹرویو کیا جو ''چٹان'' میں چھپا۔ حجازی صاحب نے ایک سوال نامہ مرتب کر دیا تھا، کیونکہ میں ''تازہ واردِ بساطِ صحافت'' تھا لہذا میرے لیے سوال نامہ استاد ہی مرتب کر سکتا تھا۔ میں تو ملک صاحب کا کوئی پس منظر، تہہ منظر اور ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میرے ساتھ ''چٹان'' کے فوٹو گرافر صلاح الدین تھے۔ میں راج گڑھ سے سائیکل پر گلبرگ میں واقع جیلانی صاحب کے گھر پہنچا تو ان کا ملازم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جیلانی صاحب اپنے بستر پر نیم دراز تھے، وہ مجھے پرتپاک انداز میں ملے اور پھر مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے کیا آپ میرا انٹرویو کرو گے؟ اوئے توں تے ہلے منڈا کھنڈا ایں'' (تم تو ابھی لڑکے ہو)۔ یہ چٹان والوں نے کیا مذاق بنا رکھا ہے، آغا شورش کا اتنا مقبول پرچہ ہے اور ایک بچے کو میرے پاس بھیج دیا ہے۔ پھر وہ کہنے لگے: اچھا آپ انٹرویو شروع کریں مجھے پتہ چل جائے گا کہ میں نے انٹرویو دینا ہے یا نہیں دینا۔ پھر انہوں نے ایک اور شرط رکھی اور کہا کہ میں نے اردو کا بائیکاٹ کر رکھا ہے اس لیے میں آپ سے یا تو انگریزی میں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

بات کروں گا یا پھر پنجابی میں، ہاں آپ اسے اردو میں ٹرانسلیٹ کر کے چھاپ دیجیے گا۔ (اب یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اردو زبان کا بائیکاٹ کیوں کر رکھا تھا) پھر انہوں نے پنجابی میں انٹرویو دیا۔ جیلانی صاحب کے اس انٹرویو کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ جب میں برطانیہ گیا تو میں نے وہاں پر سانحہ مشرقی پاکستان پر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ مکمل پڑھی۔ جب انہوں نے یہ بات کی تو میرے ہاتھ میں تو ایک بہت بڑی سٹوری آ گئی۔ کیونکہ اس وقت حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سربمہر تھی اور اسے پبلک نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ آپ نے کیسے پڑھ لی؟ اب میں سوال نامہ سے ''ڈی ٹریک'' ہو گیا اور ذہن میں خود بہ خود سوالات اٹھتے گئے۔ میں نے کہا آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ تو حکومت کی تحویل میں تھی، آپ نے اس تک رسائی کیسے حاصل کی؟ انہوں نے جواب دیا کہ 52 پونٹ سٹریٹ لندن میں میرا فلیٹ تھا اور میرے فلیٹ کے ساتھ جو میرا ہمسایہ تھا وہ ایک انگریز رائٹر اور جرنلسٹ تھا۔ (اس انگریز رائٹر کا نام اب میرے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ چٹان کی فائلوں میں اس کا نام موجود ہے)۔ اس انگریز صحافی کو بھٹو صاحب نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے لیے بلوایا تھا۔ جب وہ بھٹو صاحب کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ آپ کی سوانح اس وقت تک مکمل نہیں ہو گی جب تک اس میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں آپ کے کردار کے حوالے سے بات نہ کی جائے۔ پھر بھٹو صاحب نے اپنی بائیوگرافی کی تکمیل کے شوق میں اس صحافی کو کسی نہ کسی طرح اس رپورٹ تک رسائی دلوائی اور فوٹو کاپیاں فراہم کر دی گئیں۔ ملک غلام جیلانی کا کہنا تھا کہ لندن میں ہم ہر شام دونوں اکٹھے تاش کھیلتے تھے اور گپ شپ لگاتے اور اسی دوران اس صحافی نے بتایا کہ میرے پاس تو حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی کاپیاں ہیں تو میں نے اس سے کہا کہ ایک طائرانہ سی نگاہ مجھے بھی اس پر ڈالنے دو۔ چنانچہ میں نے وہ فائل لے لی اور پھر میں نے اس کی فوٹو کاپیاں کروالیں۔ اب وہ رپورٹ میرے پاس ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان توڑنے کے جرم میں بھٹو بھی برابر کا شریک ہے۔

جب میرا یہ پہلا انٹرویو ''چٹان'' میں شائع ہوا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا اور اس وقت چٹان ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ جس دن یہ پرچہ آیا تو اس سے اگلے روز روزنامہ جنگ نے ''چٹان'' اور ''حافظ شفیق الرحمٰن'' کا حوالہ دیتے ہوئے لیڈ سٹوری شائع کی کہ: ''بھٹو نے اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اپنے سوانح نگار کو فراہم کر دی تھی''۔ یوں میرا یہ انٹرویو اچھا خاصا مقبول ہوا۔

رفیق احمد باجوہ سے سلسلہ نیازمندی

اس کے بعد بھی میں نے مختلف لوگوں کے انٹرویوز کیے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس زمانے میں ایک بہت بڑی اور متنازع شخصیت رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ تھے۔ وہ باکمال خطیب تھے۔ باجوہ صاحب جمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی سیکرٹری جنرل تھے اور بھٹو کے خلاف بننے والے قومی اتحاد کے بھی مرکزی سیکرٹری جنرل تھے۔ ان کا بھی میں نے انٹرویو کرتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کو قومی اتحاد سے نکال دیا گیا اور آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ جس وقت تحریک عروج پر تھی تو آپ نے بھٹو صاحب سے ملاقات کر لی۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ سیاستدان تو صرف

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دھاندلی کا شور مچا رہے ہیں میں نے اس تحریک کو عوامی تحریک بنانے کے لیے ایک مشن اور نصب العین بنایا تھا۔ میرے سیاسی مقاصد ہرگز نہیں تھے۔ میری اولین کوشش یہی تھی کہ ہم ایک عوامی مطالبہ سامنے لائیں کہ: ''پاکستان کو ایسا بنایا جائے جو کہ اس کے قیام کے مقاصد میں شامل تھا۔ وہ یہ کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کیا جائے''۔ قومی اتحاد کی تحریک کے دوران جس شخص نے اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگایا تھا وہ یہی باجوہ صاحب تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں یہی مطالبہ لے کر بھٹو کے پاس گیا تھا۔ بھٹو نے میری 95 فیصد باتیں تسلیم کر لی تھیں اور میں نے واپس آ کر ابھی قومی اتحاد کو بتانا تھا کہ جماعت اسلامی اور نوابزادہ نصر اللہ خان نے ایک دم میرے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔

باجوہ صاحب کا کہنا تھا کہ دراصل یہ لوگ میرے سیاسی قد کاٹھ سے خائف تھے اور حسد کا بھی شکار تھے کیونکہ 1977ء کی سیاست میں اچانک میرا قد کاٹھ بہت بلند ہو گیا تھا۔ بس میری اسی عوامی مقبولیت کے تحت ان حضرات نے مجھے فارغ کر دیا لیکن میں خوش ہوں کہ یہ میرے ہی مطالبات کی شقیں تھیں جن کے تحت بھٹو نے جمعہ کی چھٹی منظور کی، اسلامی نظام کا وعدہ کیا اور شراب پر پابندی لگا دی۔ یہ میرا چٹان میں دوسرا انٹرویو تھا اس کے بعد تو میں نے بہت زیادہ لوگوں کے انٹرویوز کیے، فیچر اور کالم لکھے اور فکاہیہ کالمز بھی لکھے۔

میں نے جب پہلا فکاہیہ کالم لکھا اور ''چٹان'' میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے نہایت سینئر اور میرے استاد تجمل حسین دل کو دکھایا تو انہوں نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ استاد تجمل فلم انڈسٹری میں بھی کام کرتے تھے اور مسکین حجازی صاحب کے بعد ان کے قائم مقام ہوا کرتے تھے۔ میرے یہ دونوں اساتذہ تھے، جن سے میں نے صحافت کی نزاکتیں اور لطافتیں سیکھیں۔ ان کا ہینڈ رائٹنگ بہت زبردست تھا، کمال کے خوش نویس تھے۔ جی چاہتا تھا کہ بندہ ان کی تحریر، ان کے قلم اور ان کے ہاتھوں کو چوم لے۔ جملے کی بُنت میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ بے ساختہ لکھتے، چاروں طرف پریس کی مشینوں اور لوگوں کا شور ہوتا اور استاد تجمل صاحب لکھتے چلے جاتے۔ وہ حاضر طبع شاعر بھی تھے۔ پی ٹی وی پر جتنے بھی موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے ان کے سکرپٹ رائٹر استاد تجمل حسین دل ہی ہوتے تھے، وہ چوہان روڈ پر رہتے تھے اور بڑے درویش منش آدمی تھے۔

1978ء میں جب ''اسلامی جمہوریہ'' رسالے کا ڈیکلریشن واپس منصور طیب کے پاس آ گیا تو انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں استاد احسان دانش کا انٹرویو کروں' چنانچہ میں نے انٹرویو کیا جو رسالے میں شائع ہوا۔ میں نے چٹان میں معروف ادیب پروفیسر مرزا منور کا انٹرویو بھی کیا۔ مرزا منور کا تفصیلی ذکر گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے۔ میں نے اس دور میں جن اہم شخصیات کے انٹرویوز کیے ان میں ملک غلام جیلانی، رفیق باجوہ، مفتی محمود، ایئر مارشل اصغر خان، بیگم نصرت بھٹو، جسٹس بی زیڈ کیکاؤس، پیر کرم شاہ الازہری، اس دور کے امام کعبہ عبداللہ ابن السبیل، جماعت اسلامی ہندوستان امیر، پروفیسر غفور اور دیگر قائدین اور سیاسی کارکنوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ چٹان میں مَیں نے باقاعدہ کام تو 1975ء سے 1978ء تک کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ چٹان سے میرا تعلق زمانہ طالب علمی سے لے کر 94ء تک کسی نہ کسی سطح پر ضرور رہا۔ 1981ء میں مَیں نے اپنے گھر میں ''حافظ شفیق

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اکیڈمی'' بھی بنائی جو1993ء تک مسلسل چلتی رہی۔اس عرصے میں سٹوڈنٹس کی جوایورتج تعداد تھی وہ ڈیڑھ سو کے قریب رہی۔لڑکوں نے مجھ سے انٹر اور بی اے تک کے مضامین پڑھے۔

شہباز شریف صاحب کا مشورہ تھا: آپ غریب آدمی ہیں، بچوں کو پڑھائیں

میں نے 1987ء میں نواز شریف کے حلقے سے ان کے خلاف آزاد امیدوار کی حیثیت سے پہلا بلدیاتی الیکشن بھی لڑا۔ مجھے اس موقع پر شہباز شریف نے ملک ہوٹل ریواز گارڈن میں بلایا۔ میاں صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اپنے مدمقابل شاہد مقبول ایڈووکیٹ کے حق میں دستبردار ہو جائیں کیونکہ یہ وکیل صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔(یہ وہی شاہد مقبول ہیں جو بعد میں لاہور بار کونسل کے صدر بھی رہے۔یہ بڑے سلجھے ہوئے اور اچھے انسان ہیں) میں نے کہا میں اپنے پڑھے لکھے ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں۔میرا بھی تعلق تعلیم کے شعبے سے ہے اور میں بھی بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ میں نے کہا میں آپ سے مسلم لیگ کا ٹکٹ تو نہیں مانگنے آیا آپ نے خود مجھے بلایا ہے۔میاں صاحب نے کہا کہ دیکھیں آپ غریب آدمی ہیں اور بچوں کو پڑھائیں۔میں نے کہا کہ جی میں یہ الیکشن اسی روایت کو توڑنے کے لیے لڑ رہا ہوں کہ آپ جیسے لوگوں نے معاشرے میں اس بات کو لوگوں کے ذہن میں بٹھا دیا ہے کہ الیکشن میں کبھی کوئی عام اور متوسط آدمی حصہ نہیں لے سکتا۔ پھر میں نے یہ الیکشن لڑا اور جیتا۔ مجھے 1869 ووٹ پڑے اور میرے مدمقال مسلم لیگ کے امیدوار شیخ شاہد مقبول صاحب کو صرف 61 ووٹ کم پڑے۔یوں میں ان سے 61 ووٹوں سے جیتا، یہ ایک کانٹے دار مقابلہ تھا۔ میں نے یہ چار سالہ بلدیاتی دور مکمل کیا اور پھر 1991ء میں مَیں نے دوبارہ الیکشن لڑا تو مسلم لیگ نے مجھے ٹکٹ دینا چاہا لیکن میں نے کہا کہ اگر میں آپ کے ٹکٹ پر لڑتا ہوں تو اس سے میرے ووٹ کم ہو جائیں گے۔میں نے یہ الیکشن بھی جیتا۔اس کے بعد لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن کے الیکشن میں مَیں نے لاہور کے لارڈ میئر کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کو ووٹ نہیں دیا کیونکہ میں اینٹی پی پی تھا اور میں نے میاں محمد مجید (ریگل سینما کے مالک) جو مسلم لیگ کے لارڈ میئر کے امیدوار تھے، ان کو ووٹ دیا۔ لارڈ میئر کے الیکشن کے بعد لیڈر آف دی ہاؤس اور ڈپٹی لیڈر آف دی ہاؤس کی تعیناتی ہوتی ہے۔ایک رات میں سو رہا تھا کہ ڈپٹی میئر کے نامزد امیدوار اصغر بٹ نے مجھے فون پر مبارک دیتے ہوئے کہا کہ میاں شہباز شریف نے آج میٹنگ بلائی تھی اور اس میں آپ کو ڈپٹی لیڈر آف دی ہاؤس میٹروپولیٹن کارپوریشن لاہور نامزد کر دیا گیا ہے۔یوں میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے ڈپٹی قائد ایوان بلدیہ عظمیٰ لاہور رہا ہوں۔اس سیٹ اپ میں ایک لارڈ میئر ہوتا ہے اور آٹھ ڈپٹی میئرز ہوتے ہیں اور ایک قائد ایوان ہوتا اور ایک ہی ڈپٹی قائد ایوان ہوتا ہے۔مارچ 1993ء میں جب غلام اسحاق خان اور نواز شریف کی آپس میں چپقلش ہوئی اور نواز شریف نے کہا کہ میں غلام اسحاق خان سے ڈکٹیشن نہیں لوں گا تو ردعمل میں اسحاق خان نے ان کی حکومت تحلیل کر دی۔ان حالات میں بلدیاتی اداروں کی زندگی کشمکش کا شکار

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ہوگئی کہ ان کا کیا بنے گا تو انہی دنوں معین قریشی صاحب "امپورٹڈ" وزیراعظم کی حیثیت سے آگئے۔ان سے پہلے قومی اسمبلی کو غلام اسحاق خان ذبح کر گئے تھے اور اب معین قریشی نے آتے ہی منتخب بلدیاتی ادارے تحلیل کر دیے اور وہ جو شاعر نے کہا تھا کہ

سانس دیکھی جو تنِ نحل میں آتے جاتے
ایک اور چرکا دیا صیاد نے جاتے جاتے

لہٰذا قریشی صاحب نے بساط ہی لپیٹ دی۔

میں کل وقتی صحافی بن گیا

ان حالات میں میں سیاست سے بیزار ہو کر کنارہ کش ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد دوبارہ چنان جوائن کر لیا اور کل وقتی صحافی کے طور پر کام کرنے لگا۔ 1996ء میں خواجہ سعد رفیق میرے پاس آئے (یہ میرے شاگردوں میں سے ہیں۔اب وہ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں) کہنے لگے کہ اگر آپ نے باقاعدہ صحافت کرنی ہے تو میں آپ کو ضیا شاہد سے ملوا دیتا ہوں۔میں ضیا شاہد سے ملا اور میں نے مستقل کالم لکھنے شروع کیے اور طویل عرصہ تک روزنامہ خبریں کے صفحہ دو پر میرا کالم شائع ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی اکیڈمی بھی شروع کر دی۔ مئی 1997ء میں میری ملاقات طاہر عالم خان سے ہوئی۔ یہ کالج کے زمانے سے میرے دوست تھے اور آئی جی اسلام آباد ریٹائرڈ ہوئے۔اس زمانے میں یہ غالب مارکیٹ لاہور کے ڈی ایس پی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایک نیا اخبار روزنامہ "دن" آچکا ہے میں آپ کو اس کے مالک محمود صادق سے ملواتا ہوں۔اگلے ہی روز میں محمود صادق سے ملا اور انہوں نے فوری طور پر مجھے ایڈیٹوریل میں رکھ لیا اور یہاں میں نے مئی 1997ء سے 30 جون 2011ء تک مستقل کام کیا۔روزنامہ دن کا دور ایک سنہری دور تھا۔یہ اخبار اپنے وقت کا ایک موقر ترین جریدہ تھا۔یہاں بہت سے اچھے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ایک زمانے میں چونکہ روزنامہ پاکستان بھی محمود صادق صاحب نے لے لیا تھا تو میں نے قدرت اللہ چودھری صاحب اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ساتھ بھی کام کیا۔

ایثار رانا، حمید اختر، توصیف احمد خان

روزنامہ دن کے پہلے ایڈیٹر طاہر مجید کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ایثار رانا ایڈیٹر بن کر آئے تو ان کے ساتھ کام کیا۔ایثار رانا ایک مختلف قسم کے ایڈیٹر تھے۔یہ اپنے رپورٹرز اور جونیئر کے پاس جاتے اور نہایت اخلاق سے پیش آتے۔ایثار رانا آفس میں آ کر اپنے بوٹ اتار دیتے اور چپل پہن لیتے اور بعض اوقات ننگے پاؤں ہی ہر ایک کے پاس چل کر جاتے اور پرسش احوال کرتے۔ میں نے ایڈیٹرز میں ان جیسا ملنسار اور خوش اخلاق ایڈیٹر کوئی اور نہیں دیکھا۔میرے فکری اور نظری طور پر ان سے اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ان کا جو حسن اخلاق ہے اور ان کا جو خوشگوار کردار ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔"دن" اخبار ہی میں ممتاز ترقی پسند ادیب حمید اختر بھی کالم لکھا کرتے تھے۔حمید اختر نے جو کالم لکھے "کے بوم" نے مختلف عنوانات سے ان کے مجموعے شائع کیے۔انہی میں ایک مجموعہ "آشنائیاں کیا کیا" کے نام سے بھی چھپا۔ حمید اختر نے ساری زندگی "امروز" اخبار میں اداریے لکھے تھے۔

جب انہوں نے ہمارے پاس روزنامہ "دن"

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں کالم لکھنا شروع کیے اور انہیں خوب پذیرائی ملی اور لیٹرز اور ای میلز آنا شروع ہوئیں تو وہ کہنے لگے کہ بھائی ہم تو محض اداریے لکھ لکھ کر ساری زندگی ایک ''گناہ بے لذت'' کرتے رہے۔ اصل مزہ تو کالم لکھنے میں ہے۔

روزنامہ دن کے پہلے ایڈیٹوریل انچارج استادِ محترم توصیف احمد خان مرحوم تھے۔ وہ ایک علمی اور ادبی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ''مشرق'' اخبار سے انہوں نے کام کا آغاز کیا تھا۔ ایک لاابالی سی ان کی طبیعت تھی۔ وہ کسی بھی متکبر اور رعونت کے پیکر شخص کو ہرگز پسند نہ کرتے اور اسے جوتے کی نوک پر رکھتے۔ وہ اپنی جس بات کو حق سمجھتے تھے وہ چیف ایڈیٹر کے سامنے بھی کہنے سے جھجک محسوس نہ کرتے اور بلاکم و کاست کہہ دیا کرتے۔ وہ اردو ناول نگار خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے بھائی تھے۔ اور خالد احمد جو کہ ایک بہت بڑے نغز گو شاعر تھے ان کے بڑے بھائی تھے۔ توصیف احمد خان لکھنوی تھے لیکن ان کے لہجے میں لکھنویوں کے برعکس ایک اکھڑ پن تھا۔ کیونکہ لکھنویوں کی زبان میں تو لکھنوی معشوق کی کمر کا ''لوچ'' ہوتا ہے لیکن ان کی زبان ''سیف'' تھی۔ اسی طرح ممتاز صحافی اطہر ندیم صاحب بھی ہمارے کولیگ تھے۔ یہ شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور اداریہ نگار بھی تھے۔ بڑے معتدل مزاج انسان تھے۔ ترقی پسند اور سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے لیکن دین سے برگشتہ نہیں تھے۔ ایک مرتبہ مجھے بلا کر کہنے لگے کہ یار آج ایک نعت ہوئی وہ آپ کو سناتا ہوں۔ وہ نعت سنانے لگے اور ان کی آنکھیں نم ہوتی گئیں۔

اسی طرح روزنامہ دن کے ایڈمنسٹریٹر ملک لیاقت تھے۔ ملازمین کو جوڑ کر رکھتے ان کے مسائل میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ ملازمین کی ذاتی گرہ سے بھی ہیلپ کر دیتے تھے۔ یہ بڑے زبردست انسان تھے۔ سرکولیشن کے شعبے میں ایک جامی صاحب تھے۔ یہ پریس اور سرکولیشن کے بھی انچارج تھے۔ ان کا بھی کارکنوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ میں نے دن اخبار میں مئی 1998ء سے 30 جون 2011ء تک کام کیا اور 2004ء کے بعد سے تو میں مستقل اداراتی نوٹ لکھتا رہا۔ کیونکہ توصیف احمد خان صاحب کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ اطہر ندیم صاحب بھی دل کے مریض بن گئے اور یہ ذمہ داریاں کلی طور پر مجھے دے دی گئیں۔ اس سارے عرصے میں دن اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر محمود صادق نے کبھی کسی کالم یا کسی اداریہ پر مداخلت نہیں کی۔ وہ میرے متعلق کہا کرتے تھے کہ جس بندے کے کالم لکھنے پر اور دیگر کالم شائع کرنے پر آج تک مجھے کوئی ایک بھی لیگل نوٹس نہیں آیا اور کسی بھی ادارے کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ملی ایسے معقول بندے کے کام میں مَیں کیسے مداخلت کر سکتا ہوں۔ ویسے ان کی فطرت ہی یہی تھی کہ وہ صرف میرے ہی نہیں کسی بھی اخباری کارکن کے کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

اظہار رائے کی جتنی آزادی میں نے ان کے ادارے میں دیکھی مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ بعد میں محمود صادق صاحب نے دن ٹی وی چینل شروع کیا تو اس میں میرا مستقل پروگرام 'گلوبل ٹاک'' کے نام سے شروع کروایا یہ انٹرنیشنل افیئرز پر ہوتا تھا۔ میں نے ایک اور پروگرام ''ٹو دی پوائنٹ'' کے نام سے بھی کیا۔ ریحان اظہر اور ذوالفقار راحت کے ساتھ بھی پروگرام کیے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

روزنامہ ''نئی بات'' سے وابستگی

یکم اکتوبر 2011ء کو میں نے روزنامہ ''نئی بات'' جوائن کرلیا۔ میرا انٹرویو نئی بات کے مالک اور چیف ایڈیٹر چوہدری عبدالرحمٰن نے خود لیا۔ یہ سپریئر گروپ آف کالجز کے مالک ہیں۔ انہوں نے بھی ہمیشہ شفقت فرمائی اور بہت خلوص سے پیش آتے۔ نئی بات اخبار میں بطور گروپ ایڈیٹر میرا سابقہ سینئر صحافی جناب عطاء الرحمٰن کے ساتھ پڑا۔ وہ بھی عالم فاضل انسان ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے ہر بڑے انسان سے فیض پایا۔ عطاء الرحمٰن صاحب اچھرہ میں رہتے تھے اور میں اچھرہ کو لاہور کا یونان کہتا ہوں۔ اسی اچھرہ میں جہاں عطاء الرحمٰن صاحب کی رہائش تھی وہاں ایک طرف مولانا مودودیؒ موجود تھے یہ ان سے بھی اخذ فیض کرتے اور ان کے گھر کے دوسری طرف علامہ عنایت اللہ خان المشرقی موجود تھے ان سے بھی اکتساب علم کررہے تھے۔ عطاء الرحمٰن صاحب نوجوانی ہی میں مولانا سید مودودیؒ کے بہت ہی قریب ہو گئے تھے۔ سید مودودیؒ سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اگر کسی نوجوان کے ساتھ مولانا مودودیؒ کی قدرے بے تکلفی تھی تو وہ یہی عطاء الرحمٰن تھے۔ اسی طرح یہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے معتمد ترین ساتھیوں اور شاگردوں میں سے تھے۔ سیاسی حوالے سے عطاء الرحمٰن صاحب ''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان'' کے نقطہ نظر پر عمل پیرا رہتے ہیں اور اس سے وہ بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہر حال ان کا استقلال اور استقامت ہے۔ میرے ان سے سیاسی حوالے سے بہت اختلاف رہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ایک پڑھے لکھے اور مہذب انسان ہیں۔ ان سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان سے کسی بھی موضوع پر بات کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معلومات کا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ روزنامہ نئی بات ہی میں ہمارے ایک اور ساتھی زاہد رفیق تھے۔ یہ اچھے انسان ہیں اور ان کا شمار سینئر صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی بہت اچھا وقت گزرا۔ میں نے روزنامہ نئی بات میں 2019ء کے اوائل تک کام کیا۔

گھر بس گیا آخر!

میری شادی 23 نومبر 1989ء کو ہوئی۔ اہلیہ کا نام شکیلہ شفیق ہے جو لاہور کے یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے دو بیٹے اسامہ شفیق، شامل شفیق اور ایک بیٹی ربیعہ شفیق ہے۔ بڑے بیٹے محمد اسامہ شفیق نے قائداعظم یونیورسٹی سے ڈیفنس اینڈ سٹریٹجک سٹڈیز میں ایم ایس سی کیا ہے۔ بیٹی ربیعہ شفیق ہے جس نے فائن آرٹس میں بی ایس سی آنرز کیا اور تیسرے نمبر پر بیٹا شامل شفیق ہے جو اس وقت میٹرک کررہا ہے۔ اس بیٹے کا نام میں نے زارِ روس دور کے چیچنیا کے عظیم فریڈم فائٹر امام شامل کے نام پر رکھا ہے۔

میں اپنی زندگی کی مکمل آپ بیتی قلمبند کروں تو یقیناً ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ میں صحافی عبدالستار اعوان کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ اس نوجوان نے بڑی لگن اور محبت کے ساتھ میری یہ یادداشتیں اور میری زندگی کے اہم شب و روز محفوظ کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین

✠.....❖.....✠

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

MONTHLY QAUMI DIGEST LAHORE CPL NO 175

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner